ہندوستان میں شیعہ مسلمان اقلیت:

آنسوؤں کا منبر

کربلا کی جنگ کا منظر(آرٹسٹ نامعلوم)

ٹوبے ایم ہورتھ / ترجمہ: عامر حسینی

The Twelver Shî^{c}a as a Muslim Minority in India

Pulpit of tears

Toby M. Howarth

LONDON AND NEW YORK

Also available as a printed book
see title verso for ISBN details

انتساب

علامہ رشید ترابی اور علامہ طالب جوہری اور

سیدہ ہما جعفری کے نام

کربلا سے ہندوستان تک: شیعی مجالس کی تاریخ

پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خود بھی کمال کے خطیب تھے- سیرت النبی کے مصنف، ابن اسحاق نے ایک جگہ پر لکھا کہ روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر محمد علیہ السلام کے لیے سات یا آٹھ ھجری/630/629 عیسوی میں دو قدموں اور ایک نشست کا منبر بنایا گیا- اس سے پہلے وہ زیتون کے ایک درخت سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے- ان ابتدائی سالوں میں لفظ مجلس بعض اوقات لفظ مبنر کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا-

(Reference: Margoliouth,1918)

پیغمبر محمد علیہ السلام کا بیانیہ پرانے قبائلی خطیبوں سے مختلف تھا- ان کی نوعیت مذہبی تھی اور ان کا مقصد قبائلی تقسیم کو قطع کرنے والی نئی مسلم برادری کی تعمیر تھی- تاہم نئی مسلمان برادری میں خطیب کا کردار تھوڑے سے تسلسل کے ساتھ جاری رہا- اس تسلسل کا ثبوت نیزہ برداروں کی موجودگی میں دیکھا جا سکتا ہے جو کہ ابتدائی قبائلی خطیبوں کے ساتھ جڑے ہوتے تھے اور جو آج بھی جمعہ کے اجتماعات میں خطیبوں پر سایہ کیے رہتے ہیں- ایک مسلمان جو جمعہ کا خطبہ دیتا ہے خطیب کے طور پر جانا جاتا ہے- اگرچہ یہ اصطلاح شیعہ مجلس پڑھنے والوں کے لیے عام طور پر استعمال نہیں ہوتی لیکن ان کو بھی بعض اوقات خطیب کہہ دیا جاتا ہے- خطیبوں کی اب بھی قدر وقیمت ان کی طلاقت لسانی/فصحات/شستہ فن خطابت اور بنا لکھے نوٹس کے اکثر انتہائی دقیق اور ہموار بیان کے سبب کی جاتی ہے-

پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے خطابت نماز جمعہ کے اجتماعات کا لازمی جزو رہی ہے اور ان میں حاضری تمام آزاد بالغ مردوں کے لیے لازمی رہی ہے- اسلام کے ابتدائی سالوں میں، نماز جمعہ خلیفہ اور اس کے نمائندے ہی پڑھایا کرتے تھے- اس لیے یہ

اجتماع اہم عوامی اعلانات کرنے کی جگہ بن گیا تھا- خطبہ کا ایک نماں وصف خلیفہ کی تعریف اور اس کے لیے دعائے رحمت تھا جس کو خطیب آخر میں شامل کیا کرتا تھا اور اس میں حاکم کا نام بھی شامل ہوتا تھا

(Reference: Gaffney,1994:120-2)

چوتھے خلیفہ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کزن اور داماد علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) کے دور حکمرانی کے اندر، مسلمانوں میں ایک خانہ جنگی ہوئی اور اس باہمی حلفشار میں حضرت علی علیہ السلام کا بھی قتل ہوا- علی علیہ السلام کے قتل کے بعد، بنوامیہ کے بادشاہوں نے نماز جمعہ کے اجتماعات میں منابر کو حضرت علی علیہ السلام پر شب و ستم کرنے کے لیے استعمال کیا اور یہ رسم پہلی صدی ہجری کے آخری میں جا کر کہیں ختم ہوئی -

(Margoliouth,1918)

تاہم شیعہ مسلمان حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد سے براہ راست نامزد کردہ آئمہ کو ہی نائب پیغمبر علیھم السلام مانتے ہیں- یہ وہ شخصیات تھیں جو شیعان علی کے نزدیک نماز جمعہ پڑھانے اور خطبہ دینے کی اہل تھیں- شیعہ کی اکثریت نے یہ مانا کہ امام کی غیبت کے زمانے میں جمعہ کے روز ظہرین ہی ادا کی جائے گی اور ان نمازوں کو بنا خطبے کے ہی ادا ہونا چاہیے-

(Momen, 1985:170)

تاہم یہ معاملہ 14 ویں صدی سے اس وقت بدلنا شروع ہوا جب کچھ شیعہ علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگرچہ امام زمانہ غائب ہیں، ان کے نمائندے نماز جمعہ کے اجتماعات منعقد کرنے کے شرعی طور پر اہل ہیں- 16 ویں صدی میں، شیخ علی الکرا کی کے فتوے کی پیروی کرتے ہوئے، ایسے نماز جمعہ کے اجتماعات ہونے لگے-

(Arjomand, 1984:134-8)

تاہم، ایسے اجتماعات کا جواز شیعہ علماء کے درمیان اس کے بعد بھی باعث نزاع ہی رہا- ہندوستان میں 16ویں صدی یعنی 1200 هجری میں نماز جمعہ کے اجتماعات اور خطبات شیعہ کے اندر ہونا شروع ہوئے اور اس سے بھی بہت بڑا تنازع اٹھ کھڑا ہوا-6

خطبات کا کچھ اور سیاق وسباق

ابتدائی مسلمان برادری میں نماز جمعہ کے خطبات ہی تبلیغ کی واحد قسم نہ تھے- کچھ اور مواقع پر بھی یہ خطبات دیے جاتے تھے- جیسے اکثر شب جمعہ کو ایسے خطبات دیے جاتے جن کو مجالس وعظ کہا جاتا تھا-

(Margoliouth, 1918)

دوسرے خطیب بھی ہوا کرتے جو خلفاء یا ان کے نمائندوں سے مختلف ہوتے تھے جو مساجد میں خطبہ دیتے تھے اور اکثر یہ سرکاری طور پر متعین ہوتے تھے- پیڈرسن ان کو 'آزاد خطیب' کہتا ہے جن کو عربی میں واعظ، مذکر یا قاص کہا جاتا تھا- یہ خطیب مسجد میں براجمان ہوا کرتے اور لوگ ان کے گرد حلقہ بنا کر ان کو سنا کرتے، اکثر ان کو وعظ سننے کے بعد پیسے ہدیہ کرتے تھے-

کبھی کبھی وہ منبر پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کو وعظ کرتے- ان واعظین کا کام جہاد میں لڑنے کے جانے والوں کی ہمت بڑھانا، قانون شریعت سے ان کو ڈرانا اور قرآن واحادیث سے متعلقہ چیزوں کا بیان کرنا ہوا کرتا تھا-

(Pedersen, 1953: 215–31; see also Pedersen, 1948)

قدرے 'آزاد' روش کے ساتھ ایسا وعظ ابتدائی مسلمان برادری میں ایک اہم سر گرمی بن گیا اور ان لوگوں میں بڑے قد کاٹھ کے مالک حسن بصری متوفی 728 هجری/110 عیسوی بھی شامل تھے- ان لوگوں کی جانب سے اپنے گناہوں پر ندامت کے لیے ترہیب/ملامت کا عمل اور رجوع الی اللہ کی شدید تاکید اکثر ان کے سننے والوں کی طرف سے انتہائی جذباتی رد عمل کے ظہور کا سبب بنتی، جیسا کہ اپنے وقت کے ایک عظیم ترین خطیب و واعظ جمال الدین ابن جوزی متوفی 597 هجری/1200 عیسوی کے دیے جانے والے ایک وعظ کا احوال ظاہر کرتا ہے:

آنسو کی جھڑی لگ گئی اور جب وہ منبر سے اترے تو حاضرین دلوں میں پیدا ہوئی رقت کے جوش سے ہل کر رہ گئے تھے۔ 'ہم نے کبھی دنیا میں ایسے واعظ کا تصور نہ کیا تھا جو روحوں پر ایسے سحر طاری کر دے اور ان کے جذبات کو ایسے اتھل پتھل کر دے جیسا اس آدمی نے کیا!'

(Quoted in Pedersen, 1948: 241).

شیعی مجالس عزا کا پیغام اگرچہ سولہویں صدی عیسوی تک نماز جمعہ کے اجتماعات میں عام طور پر نہیں دیا جاتا تھا لیکن ابتدائی زمانوں سے ان کے درمیان دوسرے وعظ عام تھے- اور یہ وعظ وہ ہیں جو کہ اس وعظ کا براہ راست ورثہ ہیں جو ہماری اس تحقیق کا موضوع ہیں۔ یہ بعد والے خطبے وہ ہیں وہ واعظین کے خطبوں سے زیادہ ملتے ہیں بنسبت نماز جمعہ کے خطبوں سے- یہ خطبات ان مجالس عزا میں پڑھے جاتے جو حضرت امام حسین، ان کے خاندان اور پیروکاروں کی کربلا میں دی گئی قربانیوں کی یاد میں بپا کی جاتی تھیں-

کربلا کی جنگ کے بعد، حسین کے کیمپ سے بچ جانے والوں کو ایک کاروان کی شکل میں کربلا سے کوفہ اور وہاں سے یزید کے دربار واقع دمشق میں لیجایا گیا- کچھ عرصہ بعد قیدیوں کو مدینہ واپس بھیج دیا گیا جہاں سے وہ اصل میں چلے تھے، راستے میں ان کو کربلا رکنے کی اجازت دی گئی تا کہ وہ اپنے شہیدوں کا سوگ منا سکیں- شیعی مورخین کا کہنا ہے کہ سارے راستے جس سے یہ کاروان گزرا، اور خاص

طور پر جب قیدی مدینہ کو واپس لوٹ رہے تھے تو کربلا میں شہیدوں کا سوگ منایا جاتا رہا-اس سفر کی روداد میں ایک تصور مستقل موجود ہے کہ لوگ تجسس کے سبب قیدیوں کا تماشہ دیکھنے کھنچے چلے آتے تھے، لیکن یہ قیدی، خاص طور پر زینب حسین علیہ السلام کی بہن اور بیٹا زین العابدین ہر موقعہ پر جب اکٹھ ہوتا تو خطبہ دیا کرتے جو بہت زیادہ غم اور گریہ کا سبب بن جایا کرتا-7

ان میں سے دو اکٹھ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں، کیونکہ ان کا حوالہ معاصر شیعی مجالس میں اکثر دیا جاتا ہے-ایک اکٹھ وہ ہے جو عورتوں کا دمشق میں ہوا اور اس میں بی بی زینب سلام اللہ علیھا نے خطبہ ارشاد فرمایا اور دوسرا اکٹھ مدینہ میں ہوا جس میں امام زین العابدین علیہ السلام نے خطبہ دیا-ایک اور مدینہ میں تحریک عزاداری کی اہم ترین رہنما اور ایسے اکٹھ میں خطیب ام بنین تھیں، جو علی علیہ السلام کی بیوہ تھیں-یہ وعظ/خطبات جو ان رہنماؤں نے دیے کربلا میں جو ہوا، اس کی خبر پھیلانے اور شیعان امام حسین کی ہمدردیوں اور حمایت کو ابھارنے کے لیے ترتیب دیے گئے تھے-روایات سے پتا چلتا ہے کہ ابتدائی مجالس عزا میں دیے جانے والے ان خطبات میں جو سیاسی پیغام پوشیدہ تھا ان کے سبب بی بی زینب سلام اللہ علیھا کو اموی حکام نے مدینہ سے جلاوطن کرنے کا اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا-8

آنے والے سالوں اور صدیوں میں، کربلا کی یاد میں اجتماعات کا انعقاد جن کو مجالس عزا یا محض مجالس کہا جاتا ہے اہم شیعہ رسم بن گئی-9

ایک محقق جس نے ایسے اجتماعات کی تاریخ پر ریسرچ کی ہے یتزک نقاش ہیں وہ ان مجالس کو کربلا کی یاد کو زندہ کرنے اور آگے پہنچانے کا سب سے قدیم ترین زریعہ کہتے ہیں۔9

(Yitzak Nakash, 1993:163)

محمد ایوب کا دعوی ہے کہ معاصر مجالس کربلا میں ابتدائی طور پر شہداء کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریبات عزا کا ہی براہ راست تسلسل ہیں-10

کربلا کی جنگ کے بعد کے آنے والے دور میں، اموی دور (41تا132 ھجری/661تا750عیسوی) کے دوران اور عباسی دور (132تا750 ھجری/750تا1258عیسوی) کے اندر اکثر شیعی مجالس پر پابندی رہی۔ان کا انعقاد اس دوران بھی ہوتا رہا لیکن خفیہ طور پر اور یہ آئمہ اہل بیت اور ان کے پیروکاروں کے گھروں پر ہوا کرتی تھیں۔تاہم عباسی دور حکمرانی کے شروع میں ان کو عزاداری کے انعقاد کے لیے مختصر سے وقت کے لیے آزاد فضا میسر آئی تھی۔اس دور کے امام جعفر صادق علیہ السلام (80تا148 ھجری/699تا765عیسوی) نے اس مہلت کو عزاداری کا ایک باقاعدہ ڈھانچہ، خاص طرز کے مرثیہ خوانی اور شاعری کو ترقی دینے کے لیے استعمال کیا۔

(Nakash, 1993: 163)

روایات ہیں کہ یہ امام جعفر صادق علیہ السلام تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہال میں ایک پردہ تان کر عورتوں کو بھی مجالس عزا میں شریک ہونے کی دعوت دی جس میں پردے کے دوسری طرف امام جعفر صادق اور دوسرے مرد بیٹھا کرتے تھے

(Wafâ,1978: 6)

ما قبل اسلامی عرب میں، ہمیں معلوم ہے کہ قبائلی تقریب میں ایک ترجمان خطیب ہوتا جو نثر بیان کرتا اور ایک شاعر ہوتا جو منظوم کلام پیش کرتا۔ایسے ہی شیعہ مجالس میں بھی شاعر اور خطیب اپنا کام کرتے ہیں اور لوگوں میں کربلا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ایک لبنانی شیعی مورخ شیخ محمد مہدی شمس اپنی کتاب میں عزاداری امام حسین کی تاریخ کا سراغ لگاتے ہوئے بتاتا ہے کہ عباسی دور میں مجلس عزا کے دو نمایاں عنصر تھے۔ایک واقعات کربلا کا نثری بیان اور دوسرا اس سے متاثر ہو کر لکھی جانے والی شاعری کا پڑھا جانا۔

(1985: 168–70)

نویں صدی عیسوی میں پیشہ ور عزادار وجود میں آچکے تھے، پیشہ ور عزادار وہ شخص ہوتا جس کا کام مرثیے پڑھنا تھا وہ شہدا کربلا کے مصائب بیان کرتا اور مقاتل کربلا کو پڑھا کرتا۔ یہ پیشہ ور رہنما قراء الحسین کہلایا کرتے تھے-11

ایسے رہنماؤں کا کردار اسقدر اہم تھا کہ امام فرش عزا پر بیٹھے ہوتے اور شاعر منبر پر عزا کی شاعری پڑھا کرتا۔

(Wafâ, 1978: 4).

جیسے ہی عباسی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو اس کی جگہ کئی مقامی سلطنتوں نے لے لی، جو کبھی تو شیعہ کاز سے ہمدردی رکھتیں جیسے شام اور موصل میں آل ہمدان کی سلطنت تھی-اور بعد میں ایران و عراق میں آل بویہ کی سلطنت تھی-انھوں نے سرعام شیعی برادری کی پشت پناہی کی، ان کے عاشورا کے جلوسوں اور مجالس عزا کو سپانسر کیا اور اس سے کبھی کبھی فرقہ وارانہ فساد بھی ہو جایا کرتا تھا-غدیر خم -پر ولایت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے اعلان کے دن کو بھی سرکاری طور پر منایا

(Mazzaoui, 1979: 231–2)

نویں صدی میں شیعی مجالس کے پھیلاؤ اور ایام محرم منانے کے لیے مختص عمارتوں کی تعمیر کے ثبوت موجود ہیں-ایسی عمارتیں جو ایام محرم میں مجالس کے انعقاد کے لیے بنائی گئی تھیں بغداد، حلب اور قاہرہ میں موجود تھیں اور ان کو حسینیہ کہا جاتا تھا۔

(Ayoub, 1978: 154)

ابن بابویہ جن کو شیعہ شیخ الصدوق کے نام سے جانتے ہیں ابتدائی بویہ دور کے اہم ترین شیعی عالم ہیں وہ مجلس خواں تھے اور ان کو پہلا شخص کہا جاتا ہے جس نے کربلا کے موضوع کو شاعری کی بجائے نثر میں منبر پر بیان کرنے کا ایک باقاعدہ طریقہ اپنایا-12

ان کے شاگرد شیخ مفید336(تا413ھجری/948تا1022عیسوی) کی تحریریں یہ بتاتی ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی یاد میں مجالس ودیگر رسوم بشمول دیگر آئمہ کے مصائب کے بیان میں نمایاں اضافہ بھی اسی زمانے میں دیکھا گیا-13

شیخ مفید واقعہ کربلا کے بیان میں لکھتے ہیں کہ امام حسین اور دشمن کی افواج کا سپہ سالار عمر وابن سعد لڑائی سے پہلے رات کو اکٹھے ہوئے اور کافی دیر بات ہوتی رہی-اس ملاقات کف بعد، عمروابن سعد نے ایک خط گورنر کوفہ عبید اللہ ابن زیاد کو بھیجا جس مکڑا اس نے لکھا کہ امام حسین نے تجویز دی ہے کہ ان کو پھیلتی اسلامی سلطنت کی کسی بھی سرحد سے پرے بھیج دیا جائے تاکہ تنازع حل ہو جائے

(Al-Mufîd, 1981:343(

دوسری روایات میں اس سرحد سے پار علاقے کا نام ہندوستان درج ہے۔14

اگرچہ حسین علیہ السلام خود ہندوستان جانے کے قابل نہ تھے، لیکن ان کے کچھ شیعہ نے مختلف وجوہات کے تحت ہندوستان ہجرت کی -ان میں اموی اور عباسی حاکموں کی تعذیب سے بچنے کے لیے ہجرت کرنے والے بھی شامل تھے

(Hollister, 1988: 101)

یہ مہاجر شیعہ اپنے ساتھ رسوم شیعہ بھی لے کر آئے جن کے زریعے انہوں نے کربلا کی یاد باقی رکھی اور اپنی شیعی شناخت کو بھی -برقرار رکھا

شام میں آل ہمدان کے زوال کے بعد، بغداد میں بویہ اور مصر میں اسماعیلی فاطمی

سلطنت(358تا567ھجری/669تا1171عیسوی) کے سبب مسلمان دنیا میں قابل ذکر حد تک شیعہ طاقت میں اضافہ ہوا اور -ان کے جغرافیائی پھیلاؤ کے اثر بارے بالکل ٹھیک اندازہ لگانا مشکل ہے

(Momen, 1985: 83)

-دسویں صدی عیسوی کے آخر میں اسماعیلی شیعہ مبلغین نے اپنا ایک مرکز ملتان میں قائم کر لیا تھا اور یہ مرکز 20 سال تک قائم رہا

(Ahmed, 1987:276)

محرم کی یاد مناناتاہم صرف شیعہ تک محدود نہ رہ- 13 ویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں ایسے مسلمان واعظین کا ریکارڈ موجود ہے جو محرم پر مسجدوں، عوامی مقامات اور فوجی کیمپوں میں وعظ دیتے جس کو تذکیر کہا جاتا تھا۔

ایسے خطبوں میں شہداء کربلا کی مثالوں کو استعمال کر کے فوجیوں کو اپنے فرض کی راہ میں جان قربان کرنے کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ یہ -ویسا ہی عمل تھا جو ابتدائی مسلم واعظین کرتے تھے جن کا تذکرہ اس سے پہلے ہو چکا ہے

- محرم کی یاد کو شمالی ہندوستان میں صوفیا نے بھی پھیلایا- خاص طور پر چستی سلسلے نے اور اسماعیلی مبلغین نے بھی

(Rizvi, 1986, vol. 2: 292–5).

ایران اور جنوبی ہندوستان میں سولہویں صدی عیسوی میں مجالس عزا کا پھیلاؤ مسلمان برادری کے اندر شیعہ کی تقدیر میں ایک فیصلہ کن موڑ تھا- کیونکہ ان دونوں علاقوں میں شیعی رجحان کے حامل بادشاہوں کی سلطنتیں قائم ہوئیں-ایران میں صفوی تھے اور جنوبی ہندوستان کے دکن اور گولکنڈہ میں قطب شاہی تھے-15

ان دونوں حکومتوں کے دوران مجالس کی سرکاری سرپرستی اوران کی ترقی کو ایسے طریقوں سے کیا گیا کہ ان کے عزاداری کی ہندوستانی رسم پر انمٹ اثرات مرتب ہوئے اور یہ آج بھی نظر آتے ہیں-ایران اور جنوبی ہندوستان میں ابتدائی شیعہ حاکموں کے وارث حاکموں -میں ایسے بھی تھے جو شیعہ نہیں تھے لیکن شیعہ کی جانب ان کا رویہ ہمدردانہ ہی رہا

منگولوں کے حملوں کی دوسری لہر جنھوں نے صفوی ایرانیوں کی جگہ لی تیموری تھے وہ سنّی تھے-تاہم تیمور نے شیعی حاکموں کو اپنا باج گزار بنا کر کئی شیعی حاکموں کو برقرار رکھا بلکہ اس کے بیٹے اور بیوی نے مشہد میں آٹھویں امام علی رضا کے روضے کے ساتھ ایک بڑی -مسجد بنائی

(Momen, 1985: 98)

بعد میں جب صفویوں نے دوبارہ اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے بعض اوقات اپنی رعایا پر زبردستی شیعی عقیدہ مسلط کیا اور اسے ریاستی پالیسی بناڈالا-

(Halm, 1991: 84, 98; Nakash, 1993: 168)

انہوں نے شیعہ مجالس بپا کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور اس کا ایک مقصد حریف ٹرکش عثمان سلطنت کی مخالفت کو فروغ دینا تھا-

(Momen, 1985: 119)

ایران میں شیعی اسلام پھلا پھولا تو شیعی علماء کی طاقت میں بے بہا اضافہ ہوا-ان کو زیادہ وسیع قانونی بنیاد کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے بل بوتے پر وہ امام غائب کے نمائندے کے طور پر کردار ادا کر سکیں-ان کے تین کام اہم بن گئے۔ایک تو ایک اعلانیہ شیعہ ریاست کے شیعہ مذہبی رہنماء کے طور پر خمس وغیرہ اکٹھا کریں-دوسرا نماز جمعہ کی امامت اور خطبہ دیں اور تیسرا اجہاد کا اعلان کریں۔

ان کو اسقدر لچک کی ضرورت بھی تھی کہ جن قانونی معاملات میں قرآن اور حدیث کے واضح احکام نہیں ہیں،ان کے بارے میں فتوے جاری کرنے کے اہل ہو جائیں۔

سب سے پہلے عظیم شیعی عالم علامہ حلی،متوفی726ھ/1325ء نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ایک مجتھد اجتھاد کے عمل کے دوران عقلی اصولوں کی روشنی میں فتوی دینے کا اہل ہے۔

(Halm, 1991: 68–9)

اجتھاد کا عمل جانا پہچانا عمل تھا جس میں ایک مجتھد کو ایک ایک ایسے مسئلے میں فتوی دینا ہوتا ہے جس میں قرآن پاک اور حدیث مبارکہ میں واضح حکم موجود نہ ہو اور اس پر مختلف و متضاد آراء موجود ہوں۔

ایک باقاعدہ تربیت یافتہ مجتھد ہی ایسے فتوے دے سکتا ہے اور ایک عام شیعہ کو مجتھد کی تقلید کرنا پڑتی ہے۔ اس مکتب فکر نزدیک عقلی اصول کیونکہ ایسے معاملات میں شرعی رائے کا اظہار کرنے میں مرکزی حثیت رکھتے تھے تو اسے شیعی اصولی مکتب فکر کا نام دیا گیا۔

اگرچہ حلی نے اجتھاد کا اصول وضع کیا تھا لیکن یہ سترھویں صدی کے ایران میں جا کر ہوا کہ ان اصولوں کا بڑے پیمانے پر ریاست کی تنظیم اور انتظامیہ پر اطلاق کیا گیا۔ اجتھاد کے اصول نے اصولی شیعہ علماء کو ان اصولوں کے اطلاق کے لیے وسیع پیمانے پر اختیارات دے دیے تھے۔ اس پر قدامت پرست شیعی علماء میں سخت رد عمل پیدا ہوا۔ یہ قدامت پرست شیعی علماء وہ تھے جو قرآن و حدیث سے شرعی فتوے جاری کرتے تھے اور ان کو اخباری کہا جاتا تھا۔ 16

ان دو شیعی اسکولوں کے درمیان جن عملی مسائل میں بڑا اختلاف سامنے آیا ان میں سے ایک امام کی غیبت میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا مسئلہ تھا۔ اخباری شیعہ علماء کا مکتب امام کے زمانہ غیبت میں نماز جمعہ کی بجائے ظہرین کی ادائیگی کا قائل تھا۔ اصولی شیعی علماء نے اخباری کے برعکس نماز جمعہ کے اجتماع کو لازم اور واجب قرار دیا۔ ان کے مطابق نماز جمعہ کو امام کی غیبت کے زمانے میں ان کے نمائندے یعنی مجتھد پڑھائیں گے۔ قریب قریب 200 سال یہ اختلاف چلتا رہا۔ یہ اختلاف اس وقت دم توڑ گیا جب اصولی شیعہ صفویوں کے دور میں غالب آ گئے۔ صفویوں کے زیر انتظام علاقوں اور عراق میں نجف اشرف وغیرہ میں انیسویں صدی میں نماز جمعہ کے اجتماعات باقاعدگی سے ہونے لگے۔

(Momen, 1985: 117–18)

اس طریقے سے نماز جمعہ کے اجتماعات میں منبر شیعی عقائد اور شیعی تبلیغ کے پھیلاؤ کے لیے ایک اہم زریعہ بن گیا اور یہ شیعی تبلیغ کو ایک اہم محرک دینے کا سبب بھی بن گیا۔

ایران میں صفوی شیعہ حکومت نے جہاں شیعہ علماء کو طاقتور بنایا تھا، وہیں پر مجلس عزا کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ صفوی حکومت کی تشکیل کے چند سالوں کے اندر ایران کے اندر عزاداری کی تقریبات میں شہدائے کربلا کے بیان پر مشتمل ایک کتاب بہت مقبول ہو گئی۔ یہ 'روات الشہداء' (باغ شہداء) تھی۔ اس کا مصنف حسین واعظ کاشفی متوفی 910ھ/1504ء تھا۔ یہ سنّی محدث و مفسر قرآن تھے۔

(Momen, 1985: 100)

اس کتاب میں فارسی اشعار بہت زیادہ نقل کیے گئے تھے۔ اس چیز نے مجلس عزا کے فروغ میں کافی اہم کردار ادا کیا۔

(Rizvi, 1991: 31)

دو صدیوں تک یہ کتاب کربلا کی یاد کو زندہ رکھنے میں معیار کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ اس سے اقتباس کو پڑھا جاتا اور اسے روضہ خوانی کا نام مل گیا اور یہ اسقدر مقبول عام عمل بن گیا کہ مجلس خواں کو روضہ خواں کہا جانے لگا تھا۔

(Nakash, 1993: n. 32, p. 170)

میری ہیگلینڈ معاصر پشاور (کے پی کے) میں عورتوں کی مجالس عزا میں مجلس خوانی کرنے والی عورتوں کے روضہ خواں کی اصطلاح کی استعمال کرتی ہے۔ اور یہ اصطلاح اب بھی ایران کے ساتھ ساتھ بر صغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں استعمال ہوتی ہے۔

(1995: 188)

صفوی بادشاہت کے آخری زمانے اور قاچار بادشاہت میں(1193ھ/1779ء-1342ھ/1924ء)روضۃالشہداءخوانی پہلے تو ڈرامائی شکل میں تبدیل ہوئی جسے 'شبیہ' کہتے ہیں اور بعد میں یہ تعزیہ (تھیٹریکل میلوڈراما) میں بدل گئی 17۔ دونوں کربلا کے المیہ کی اعلی سطح کے سٹائل کے ساتھ ڈرامائی تشکیل تھیں۔ تعزیہ جو تھیٹریکل میلوڈراما ہوتا تھا اسے پختہ عمارتوں جن کو تکیہ یا حسینیہ کہا جاتا کے اندر اسٹیج کیا جاتا تھا۔18

کئی ایک یورپی سیاحوں کی سر گزشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تھیٹریکل میلوڈراموں کے تناظر سے مطابقت رکھنے والے خطبات پڑھے جاتے تھے۔ ایک فرانسیسی سیاح اے ڈاگوبینو جس نے اٹھارہ سو پچاس عیسوی کا زمانہ فارس/ایران میں گزارا تھا۔ وہ ان خطبات کو تعزیہ کہلانے والے تھیٹر ڈراموں کے لیے 'وارم اپ' قرار دیتا ہے۔ وہ محرم کے دنوں میں اسٹیج ہونے والے تعزیہ ڈراموں کو 'جذباتی کھیل' قرار دیتا ہے۔19 وہ عزادار مردوں کے دستوں کا ذکر کرتا ہے جو سینہ کوبی کر رہے ہوتے تھے۔ اور وہ لکھتا ہے کہ مردوں کے وہ ماتمی دستے منبر کے سامنے صف بندی کرتے تھے۔ خطبے کا بیان کر کے وہ بتاتا ہے:

جیسے ہی سینہ کوبی کے بعد خاموشی پلٹ آتی تو سبز عبایا پہنے ایک شخص اسٹیج پر آتا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ وہ بازار میں ' ایک سبزی فروش کی طرح لگتا تھا۔ وہ آدمی جنت کا بیان کرتا اور اس کی وسعت اور شان و شوکت بارے بتاتا۔ جنت جانے کے قرآن و حدیث پڑھنا کافی نہیں ہے۔ "قرآن جن باتوں کا حکم دیتا ہے ان کا پڑھنا ہی کافی نہیں ہے؛ ہر روز تکیہ/حسینیہ آنا اور آنسو بہانا کافی نہیں ہے جیسا تم کرتے ہو۔ تمہارا اچھے اعمال حسین اور محبت حسین کے نام پر کیے جانا بھی ضروری ہیں۔ یہ حسین ہیں جو دروازہ جنت ہیں۔ یہ حسین ہیں جو دنیا کے کام سنوارتے ہیں؛ یہ حسین ہیں جن کے زریعے سے نجات اخروی ملتی ہے۔ پھر وہ زور سے چلا کر کہتا ہے، 'حسین، حسین!'

سارا مجمع چلانے لگتا ہے، 'یا حسین، یا حسین!'

''''بہت اچھے، اب ایک بار پھر۔

"!یا حسین، یا حسین"

اب وہ خدا کے حضور مناجات پڑھنے لگتا ہے،

"دعا ہے اللہ تمہیں ہمیشہ محبت حسین سے سرشار رکھے۔ "

سارا مجمع ایک ساتھ اپنے ہاتھوں کو بلند کرتا ہے اور مرتعش آواز میں پکارتا ہے، 'یا اللہ!'20

بہمنی بادشاہت کے دربار سے وابستہ اشراف اور فوج میں بہت سے شیعہ تھے۔ یہ بادشاہت حیدرآباد دکن پر 748ھ/1347ء سے حکومت کرنے لگی تھی۔ ان شیعہ میں بہت سے فارسی نژاد مہاجر تھے جنھوں نے ہندوستان کے مغربی ساحلی شہروں اور بحری راستوں سے یہاں پر رہائش رکھی تھی۔ وہ بہمنی سلطنت میں آفاقی (غیر ملکی) گروہ کا ایک اہم جزو تھے جس کی مقابلہ بازی شاہی دربار میں اپنے حریف گروہ سے تھی جس کو دکھنی (مقامی) گروہ کہا جاتا تھا۔ دکھنی گروہ میں ایسے لوگ شامل تھے جو کہ شمالی ہندوستان سے 695ھ/1296ء میں پہلے ترک مسلم حملے کے وقت آئے تھے۔ دونوں گروہ اکثر ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے اور ان کی حریفانہ مقابلے بازی نے بہمنی سلطنت کو 16ویں صدی کے آغاز میں پانچ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ بہت سے بہمنی حکمران آفاقیوں کے شیعی عقیدے سے ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ حکمران محرم میں مجالس عزا میں شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے عاشور خانے تعمیر کیے۔

محمود گاوان، ایک بہمنی وزیر تھا اور امور مملکت میں مرکزی کردار ادا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں پورا گمان ہے کہ وہ شیعہ تھا۔

(Hollister, 1988: 110)

اس نے عراق اور ایران سے بہمنی دارالحکومت بیدر میں بہت سے شیعہ عالم لا کر بسائے تھے جہاں وہ محرم کے پہلے دس دنوں میں مجالس خوانی کیا کرتے تھے۔

(Wafâ, 1978: 9)

اگرچہ بہمنی سلطنت میں کچھ شیعہ مسلمان اونچے حکومتی عہدوں تک پہنچ گئے تھے لیکن سولہویں صدی کے شروع میں بہمنی سلطنت سے ٹوٹ کر بننے والی سلطنتوں میں سے دو بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں تھیں جنھوں نے شیعہ اسلام کو سرکاری مذہب قرار دے ڈالا تھا۔

(Khalidi, 1991: 6)

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے بانی نے محمود گاوان کے بیٹے کو اپنا متبنی بنالیا تھا۔ 907ھ/1502ء میں اس نے صفوی بادشاہ کی پیروی کرتے ہوئے شیعہ اذان رائج کی اور خطبہ جمعہ میں شیعہ آئمہ کے نام شامل کروائے۔ اس طرح اس نے شیعی اثناء عشری اسلام کو ریاست کا باقاعدہ سرکاری مذھب قرار دے ڈالا، ایسا ہندوستان میں پہلی بار ہوا تھا۔ 21

بہمنی سلطنت سے ٹوٹ کر بنی جس دوسری سلطنت نے شیعی مذہب اختیار کیا وہ قطب شاہی سلطنت تھی جو 924ھ/1518ء میں بنی اور 1099ھ/1687ء تک قائم رہی اور یہ گولکنڈا میں بنی تھی۔ یہ پانچ سلطنتوں میں سب سے اہم سلطنت بن گئی تھی۔ اسی بادشاہت کے تحت حیدر آباد شہر بسایا گیا اور یہ واقعہ 999ھ/1591ء میں ہوا۔ 22

اگرچہ قطب شاہی حکمرانوں نے شیعی اسلام کو ریاستی مذہب کا درجہ دے ڈالا تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں نماز جمعہ کا خطبہ وہی ہوتا تھا جو سابقہ سنّی انتظامیہ کے دور میں پڑھا جاتا تھا۔ پھر انھوں نے اس خطبے میں تین خلفاء (ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنھم) نام نکال کر آئمہ اثناء عشرہ کے اسمائے گرامی شامل کر دیے۔

(Rizvi, 1986, vol. 2: 263–4)

یہ رسم ایران کے شیعی اصولی علماء کی تعلیم کے مطابق تھی جن کا شاہی دربار پر غلبہ ہو چکا تھا۔

(Khalidi, 1991: 6; Rizvi, 1991: 23–4).

بیدر اور گولکنڈہ میں شیعی انتظامیہ کی سرپرستی میں، محرم میں عزاداری بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ ساتویں قطب شاہی حکمران سلطان عبداللہ (1626-72ء/1035-83ھ) کے دور میں جو نمایاں رسوم عزاداری باقاعدگی کے ساتھ ادا کی جاتی تھیں ان کو دربار کے مورخ نظام الدین احمد نے 'حدیقۃ السلاطین' کے نام سے بیان کیا ہے۔23

یہ بیان بڑی رسوم میں تین قسم کے عزاداروں کے کردار کا ذکر کرتا ہے: مرثیہ خواں، ذاکر اور خطیب۔ یہ تینوں کردار اکھٹے بعد آج کے زمانے میں بپا ہونے والی مجالس عزا میں اکٹھے ہو گئے۔ پہلی قسم کے عزادار، آئمہ اہل بیت کے لیے لکھے گئے مرثیوں کو پڑھتے تھے جس کو نظام الدین کے بیان میں دلپذیر مرثیے خوانی کہا گیا ہے۔ مرثیہ شہدائے کربلاء اور بعد میں آنے والے آئمہ اہل بیت کے لیے خاص طرح کی سوگواری پر مشتمل رثائی کلام ہوتا ہے جو پہلے فارسی اور عربی میں لکھا جاتا تھا۔ دکنی حکمرانوں کی سرپرستی میں جنھوں نے خود بھی مرثیے کہے یہ ہندوستانی شکل میں لکھے جانے لگے۔ ان کو قدیم دکنی کی ہندوستانی زبانوں اور اردو میں بھی لکھا جانے لگا۔ اس میں دکنی فطرت اور ثقافت جیسے مقامی عناصر کا بیان بھی شامل ہو گیا۔24 ان مراثی میں آئمہ اہل بیت اور دوسرے شیعہ ہیروز کے اعمال حسنہ کی تعریف ہوتی وہیں ان کے مصائب کا بیان بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ مرثیہ خوانی قریب قریب 300 سال کی دکنی مجالس کا سب سے اہم عنصر بن گئیں تھی۔ تو دکنی مجالس عزا کی ادبی تاریخ اصل میں تاریخ مرثیہ ہے۔

(Mosvi, 1989)

نظام الدین احمد کے بیان میں عزاداروں کی دوسری قسم ذاکر کہلاتی ہے۔ قطب شاہی دور میں کاشفی کی روات الشداء کو پڑھنے والے کو ذاکر کہا جاتا تھا جس کا صفوی ایران سے تعلق پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔ نظام الدین لکھتا ہے کہ 'عزاداروں کے جم غفیر کی انکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جایا کرتی اور سوگواریت کے ساتھ حالت جذب میں زور زور سے سسکیوں کی آوازیں ابھرا کرتیں جب جب زاکر کوئی انتہائی پر اثر بیان کرتا۔

(Rizvi, 1986, vol. 2: 336).

تیسری قسم جو نظام الدین بیان کرتا ہے وہ ایک شاندار خطیب ہوتا، جو ایک بلیغ خطبہ باآواز بلند پڑھتا تاکا شہدائے کربلا سے برکات وصول کرسکے اور سلطان کی خوشحالی کے لیے سفارش کو پیدا کرسکے۔ یہ خطباء جو غالب امکان ہے علماء ہوا کرتے تھے کہا جاتا ہے واقعات کربلا اور مصائب امام حسین بیان فرمایا کرتے تھے۔

(Rizvi, 1986, vol. 2: 336–7)

دکن میں واقعہ کربلا کا بیان زبانی یاد کیا ہوا متن ہوا کرتا تھا اور خطبے کے تناظر میں اس کا ذکر محرم کی تقریبات کا ایک حصّہ ہوا کرتا تھا لیکن مرثیہ کو سب سے بلند مقام حاصل تھا۔ جبکہ صفوی دور میں ایران کے اندر شیعہ مذہب زبردستی کا مسلط کردہ ریاستی مذہب تھا لیکن ہندوستانی دکن میں پالیسی بالکل مختلف تھی۔ صادق نقوی اور دیگر کا کہنا ہے کہ قطب شاہی حکومتوں نے ریاست کی ایک مذہبی شناخت پیدا کرنے کی کوشش شیعی رسومات کو ہندوستانی قالب دیکر کی اور اس طرح سے وہ وہاں کی سب مذہبی برادریوں کی رسائی میں آگئیں۔ اس طرح سے ہندؤ اور سنّی مسلمان بھی عزاداری امام حسین (علیہ السلام) میں شریک ہونے کے قابل ہوگئے جبکہ ان کو اپنے بنیادی عقائد بھی ترک نہ کرنا پڑے۔25

ہندوستانی سیاق وسباق میں عزاداری کے رچاؤ کی امثال میں مرثیوں کو ہندوستانی راگ راگنیوں میں پڑھنا، مہندی کی رسم کو خاص طرح سے پیش کرنا جو اس شادی کی یاد کے طور پر ہوتی تھی جو امام حسین کی بیٹی اور امام حسین کے بیٹے کی کربلا میں ہوئی تھی اور بہت سی چیزوں کی تعظیم و تکریم کے متعدد طریقوں کو محرم کی رسومات میں شامل کرنا ہیں۔26

سن 1099ھ/1687ء میں قطب شاہی سلطنت کو سخت گیر سنّی مغل بادشاہ اورنگ زیب (1617/1026ء) کی فوج نے تاخت وتاراج کرڈالا۔ اس نے شیعی رسوم کو ختم کردیا۔ حیدرآباد میں عاشورخانوں کو گھوڑوں کے اصطبل میں بدل ڈالا۔ اگرچہ آصف جاہی حکمران (1720/1132 - 1948/1367) جو قطب شاہی حکمرانی کے بعد آئے اکثر شیعی کاز سے مخلص تھے لیکن دکن پر حملے نے شیعی ثقافت کے مرکز کو شمالی ہندوستان میں منتقل کردیا۔ خاص طور پر یہ مرکز شیعی حکمران کی ریاست اودھ (1856/1272-1722/1134) میں قائم ہوگیا۔ اس وجہ سے ہی ہم پہلے مجلس عزا کا ارتقا اٹھارویں صدی سے بیسویں صدی میں شمالی ہندوستان میں دیکھیں گے اور پھر ہم واپس اسی دور میں اس کے ارتقا کا جنوبی ہندوستان میں جائزہ لیں گے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہندوستان میں مجالس عزا

جنوبی ہندوستان میں جہاں محرم کی تقریبات کو شاہی سلاطین کی سرپرستی حاصل تھی، وہیں شمالی ہندوستان میں مغلوں کی حکومت میں صورت حال مختلف تھی۔ مغل حکمران (932ھ/5126ء-1274ھ/1858ء) سنّی مسلمان تھے اور وہ شیعی صفوی حکمرانوں کے مغرب کی طرف رویے سے پریشان تھے کیونکہ صفوی شیعی حکومت نے دکنی شیعہ سلطنت سے جوان کے جنوب میں واقع تھی اتحاد بنالیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں، شمال کے ہندوستانی شیعہ مسلمان زیر عتاب آئے اور اکثر ان کو تقیہ یعنی اپنی مذہبی شناخت کو چھپانا پڑا جو کہ شیعہ اسلام میں جائز ہے بلکہ بعض حالات میں تو اس کی تاکید کی جاتی ہے۔27 تاہم اورنگزیب ان شیعہ مسلمانوں کے خلاف کم سخت تھا جو کہ فارسی النسل مہاجر تھے اور مغل کے طور پر معروف تھے کیونکہ وہ بطور فوجی اور منتظموں کے مراعات یافتہ تھے۔

(Rizvi, 1986, vol. 2: 37)

اورنگ زیب کے دربار میں، 486اعلی سطح کے عہدے داروں میں 28فیصد ایرانی نژاد تھے-

(Cole, 1989: 81)

شمالی ہندوستان میں بھتسے شیعہ رہ رہے تھے اور وہاں محرم منایاجاتا تھا، لیکن مغل ریاست نے شیعہ مسلمانوں کو ایک ممتاز برادری کے طور پر ابھرنے سے روک رکھا تھا- جیسا کہ جون کول لکھتا ہے، 'مغل دور میں، اور خاص طور پر اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں، شیعہ مسلمان، سنّی مسلمانوں سے ہٹ کر الگ سے پبلک میں رسوم ادا نہیں کر سکتے تھے جو کہ کسی برادری کی شناخت کے لیے اہم بات ہوتی ہے- ایک اصلی مذہبی کمیونٹی کے اندر مذہبی شناخت اور سماجی بندھن لوگوں کو جوڑنے والی رسومات کے گرد ہی نشو و نما پا سکتے ہیں-'

(1989: 92)

اس طرح جب 1134ھ/1722ء میں ایک شیعی مسلمان اشراف کو دہلی میں مغل دربار کی طرف سے اودھ بطور جاگیر بخش دیا گیا، اور اس کے خاندان کے پیش رو حاکموں نے مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اپنی خود مختاری کا اعلان کرنا شروع کر دیا، تو نتیجے میں حکومت ہندوستانی شیعہ مسلمانوں کو بہت ہی اہم گننے لگی- اودھ کے حاکم پہلے نواب کے لقب سے جانے جاتے رہے تاوقتیکہ انھوں نے خود کو بادشاہ کہلانے نہ لگے- اور یہ وہ موقعہ تھا کہ خاص طور پر شیعی رسومات کی دوبارہ ریاست نے حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی- اور یہ سرپرستی و حوصلہ افزائی اکثر بڑے شاہانہ انداز میں ہوا کرتی تھی-28

یہاں تک بیان کیا جاتا ہے، 'غازی الدین حیدر کا پسندیدہ ہاتھی 'واہ حسینا' کی دھن پر سدھایا گیا تھا-'

(Schimmel,1979: 211)

جب ریاست اودھ کا زوال 1272ھ/1856ء تو مجالس عزا کے خطبات اس شکل میں ترقی پا چکے تھے جس سے آج ہم واقف ہیں-

اودھ میں شیعی اسلام کی ترقی اور استحکام میں سب سے اہم عالم مولانا سید دیدار علی نصیر آبادی (1166ھ/1753-1235ھ/1820) تھے- وہ غفران مآب کے نام سے معروف تھے- ایران اور عراق میں موجود اہم مزارات مقدسہ والے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد دیدار علی واپس اپنے آبائی وطن شمالی ہندوستان لوٹے اور شیعہ اصولی مکتبہ فکر کے سب سے بڑے علمبردار بن گئے، جس کے خلاف وہ پہلے علمی جدل و مناظرہ کرتے رہے تھے- شیعہ مسلمان اگر شمالی ہندوستان میں ایک ممتاز مذہبی برادری کے طور پر ترقی کرنا چاہتے تھے تو ان کو شیعی رسومات کے ساتھ نماز جمعہ کے اجتماعات کو بھی جوڑنے کی ضرورت تھی- یہ نکتہ سید دیدار علی نے اٹھارویں صدی کے آخر میں اچھے سے سمجھ لیا تھا اور اس نے ریاست اودھ میں دونوں یعنی شیعی رسومات اور نماز جمعہ کا اجتماع عوام میں کرنے کے لیے دلائل دیے- اور شیعی رسومات اور نماز جمعہ کے اجتماع کی قیادت بھی کی-

نماز جمعہ کے اجتماعات کے ساتھ ان کے خطبات بھی آئے، اور بتدریج شمالی ہندوستان کے شیعہ مسلمانوں نے منبر کو صرف شاعری اور نثر میں کربلا کے واقعہ کی یاددہانی کے لیے مخصوص نہیں رکھا بلکہ یہ استدلال اور تدریس کے لیے بھی استعمال ہونے لگا- دیدار علی زبردست مبلغ تھے اور ان کے 50 خطبات کا مجموعہ سن 1200ھ/1786ء میں فوائد آلاصفیہ و مواعظ حسینیہ کے نام سے شایع ہوا-29 دیدار علی آپ خود کبھی مجالس عزا سے خطاب نہیں کرتے تھے- اگرچہ ان کے بیٹوں نے ایسا کیا-30 خاص طور ان کے چھوٹے بیٹے سید حسین اور ان کے پوتے علی محمد (متوفی 1894/1312) معروف ذاکر کے طور جانے جاتے تھے-، انھوں نے وعظ/ذاکری پر ایک کتاب طہارت الواعظین لکھی تھی-

(Rizvi, 1986, vol. 2: 139)

جس وقت دیدار علی نماز جمعہ کے اجتماعات کاانعقاد اور مجالس عزا و دیگر رسومات شیعہ اسلام کو عوامی سطح پر ادا کرا رہے تھے تو یہ سب اودھ میں تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ مسز میر حسن علی، ایک انگریز خاتون جن کی شادی ہندوستانی شیعہ مقیم لکھنؤ سے ہوئی تھی جو اودھ ریاست کا مرکزی شہر تھا، 1231ھ/1816ء-1243ھ/1828ء کے دوران میں وہ لکھنؤ میں رہی۔ اس نے تفصیل سے ان رسومات و شعائر کا اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ کتاب کا نام ہے "مسلمانانِ ہند بارے مشاہدات'(1917)۔ وہ لکھتی ہے کہ لکھنؤ کے امراء اپنی حویلیوں میں خصوصی طور پر تعمیر کردہ ہال کمروں میں مجالس کا انعقاد کیا کرتے تھے جن کو امام باڑے کہا جاتا ہے۔31 دن میں محرم کے پہلے دس روز ان مجالس عزا کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ مجالس ایک مذہبی عالم یا مولوی کی طرف سے بزبان فارسی واقعہ کربلا کے بیان سے شروع ہوا کرتی تھیں۔ اور ان کو دہ مجالس /دس مجالس کہا جاتا تھا۔ درمیان میں وقفہ ہوتا اور اس وقفے میں میٹھا شربت اور حقے سے سب کی خاطر و تواضع کی جاتی تھی۔ وقفے کے بعد، کئی ایک لوگ مرثیہ خوانی کیا کرتے۔ مرثیہ خوانی کے بعد تبرا و تولا کی رسم ادا کی جاتی اور یوں مجلس کے آخر میں ماتم ہوتا اور مجلس اس کے ساتھ اختتام پذیر ہو جاتی۔ مجلس میں سختی سے آداب کو بجالایا جاتا۔ وقفے کے دوران کم عمر امرا کو اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں سے اجازت لیے بغیر حقہ پینے کی اجازت نہ تھی۔ اور مجالس عزا میں گریہ کے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔

(Mrs Ali, 1917: 22–3)

اس کے مردوں کی مجالس پر جو نوٹس ہیں ان میں آگے چل کر مسز علی عورتوں کی مجالس عزا کا بھی ذکر کرتی ہے (ص 9تا23)۔

'عورتوں کی مجلس عزا بعض اوقات ایک خصوصی امام باڑے میں ہوتی جس کی تعمیر کسی طبقہ اشرافیہ کی عورت نے کی ہوتی تھی یا پھر عوامی امام باڑے میں جسے عاشورا محرم کے کسی ایک دن کے لیے خواتین کی مجلس کے لیے مختص کر دیا جاتا تھا۔

(Hollister, 1988: 174)

تاہم زیادہ تر عورتوں کی مجالس عزاداری اشراف خواتین کے گھروں میں مختص عزاخانوں میں ہوا کرتی تھی۔ مسز علی یاد کرتی ہیں کہ کیسے بعض تعلیم یافتہ عورتیں واقعہ کربلا کا ویسے ہی بیان کرنے کے لیے کرائے پر لی جاتیں جیسے مرد ہائر کیے جاتے تھے۔ مرثیہ خوانی کے لیے بھی کچھ پیسوں کے عوض تعلیم عافتہ خوش گلو عورتوں کو ہائر کیا جاتا تھا۔ ان کو اچھا خاصا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ وعظ و مرثیہ خوانی کرنے والی زیادہ تر بڑی عمر کی غیر شادی شدہ، کنواری عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور غریب سید خاندانوں سے ان کا تعلق ہوا کرتا تھا۔

یہ دیکھنا بھی اہم ہے کہ مسز علی کے بیان کے مطابق واقعہ کربلا کا بیان/ کتاب خوانی دربار کی پرانی زبان فارسی میں ہوا کرتا تھا اور مرثیے مقامی زبان اردوں میں پڑھے جاتے تھے۔32 شاید اسی وجہ سے اس زمانے میں کتاب خوانی سے کہیں زیادہ مرثیوں کو سنا مقبول تھا۔ جیسا کہ وہ لکھتی ہے، 'مرثیہ مصائب کربلا کی واقعی پر سوز اور دلچسپ کمپوزیشن تھی۔ ملکی زبان میں کیے گئے اس کام کا ہر لفظ نہ صرف سمجھا جاتا بلکہ نہایت گہرائی میں جا کر محسوس بھی ہوتا تھا۔

(Mrs Ali, 1917: 29)

جدید مجالس کے ارتقا کا حصّہ مجالس عزا میں شاعری کے غلبے سے نثر کے غلبے کی تحریک تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری نے فارسی سے اردو تک کا سفر نثر خوانی سے کہیں پہلے کر لیا تھا اور یہ اب بھی مجلس عزا میں اہم مقام رکھنے کی دعوے دار تھی۔ مسز علی یہ سب مرثیے کی مقبولیت جب آسمان کی بلندیوں یو چھو رہی تھی تب لکھ رہی تھیں۔ مرثیہ کی کمپوزنگ اور اس کی ادائیگی کا فن دکن سے شمالی ہندوستان آیا، جہاں یہ اپنے عروج پر دو شاعروں کے سبب پہنچا جن میں ایک میر انیس (متوفی 1292ھ/1874ء) اور دوسرے مرزا دبیر (متوفی 1292ھ/1975ء) تھے۔ جیسے سی ایم

نعیم اپنامشاہدہ درج کرتے ہیں، 'ہیر واور ہیر وئین عرب ہیں لیکن وہ لکھنؤ کے شر فاء سابرتاؤ کرتے ہیں-ان کی سماجی حدود، شادی بیاہ، تقریر کانسائی انداز، خاندانی رشتے ناطے سارے کا سارے ہندوستانی ہیں بلکہ شمالی ہندوستان کے بالائی مسلم طبقے سے ہیں-روضۃ الشہداء کاایک اردو ترجمہ 'کربل کتھا' کے نام سے پہلے ہی فاضل علی (فاضلی) 1145ھ/1732ءاور 1162ھ/1749ء کے درمیان ہوچکا تھا-مصنف دیباچہ میں لکھتاہے کہ ترجمہ جواس نے کیاہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل متن کے فارسی محاوروں کواس نے دیکھاعورتیں سمجھ نہیں پاتیں-

(Rizvi, 1986, vol. 2: 355)

یہ ترجمہ قدرتی طور پر بہت مقبول ہو گیااور حیدر آباد میں بھی اسے استعمال میں لایاجانے لگا-

(interview, SN)

اگرچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسز علی اپنے بیان میں اس کاذکر نہیں کرتیں-مسز علی کتاب خوانی بارے لکھتی ہیں جس کے ساتھ وہ واقف تھیں-(لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکتی تھیں کیونکہ وہ فارسی میں ہوتی تھی)، 'مجھے یقین ہے کہ یہ بہت پر سوز، شاندار کمپوزیشن ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے آئمہ کی تاریخ کا ہر ایک خاص تناظر میں ایمان افروز بیان تھا-'تاہم ایسا نظر آتاہے کہ علماء بشمول دیدار علی اس کواسقدر اعلی خیال نہیں کرتے تھے-جیساکہ ایک مسودہ جو 1231ھ/1816ء میں بعد کی نصف صدی بارے لکھا گیا، مشاہدہ بیان کرتاہے، 'شیعہ مسلمانوں کی بڑی مجالس میں مرثیہ خوانوں کاغلبہ ہوا کرتا تھا، جن کو مرثیہ کی ادائیگی کی خاص تکنیک پر عبور ہوا کرتا تھا جبکہ علماء ان مجالس میں اتنے غالب نہ تھے، جواکثر ان مجالس میں ہونے والی مقامی فوک رسومات پر غصّہ ہو جایا کرتے تھے-33

دوسرے ماخذ تصدیق کرتے ہیں کہ کیاچیز مجلس خوانی کواچھا بناتی ہے، اس پر اختلاف موجود تھا، اور علماء مجالس عزامیں مستند چیزوں کی خوانی کے زیادہ قائل تھے: 'سنّی علماء کا سب سے بڑا اعتراض تھاکہ غلط روایات منبر بیان کی جاتی ہیں-اس وجہ سے، ہر روز ستر مجالس ہوتی ہیں اور جن میں صرف مستند روایات روایات بیان کی جاتی ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ ان میں شریک ہوتے ہیں-34

دیدار علی کوان مجالس میں پڑھی جانے والی چیزوں کی بڑی فکر رہتی تھی جن میں اکثر مبالغے سے کام لیاجاتا تھا یا کربلا کے من گھڑت واقعات بیان کر دیے جاتے تھے یا آئمہ اہل بیت اطہار کی زندگیوں بارے جھوٹ بول دیا جاتا تھا-انھوں نے اپنے شاگردوں کوان مجالس میں مستند روایات بیان کرنے پر اکسایا-ان کے شاگردوں میں سے ایک میر اکبر علی رضوی تھے-انہوں نے بتایاکہ وہ استاد کے کتب خانے کواستعمال کرتے تاکہ ہندی زان میں مجلس خوانی کی ایک سیریز تشکیل دے سکیں جو خود دیدار علی کی اپنی مجالس میں پڑھی جاتی تھیں اور پھر دوسروں کے استعمال کے لیے ان کو چھاپ دیا جاتا تھا-

(Hidâ'î, 1988: 3–14)

یہ مجالس خوانی دیدار علی کی وفات کے ایک سال بعد 'ضیاءالابصار' کے عنوان سے شایع کی گئیں-چودہ ابواب میں سے ہر ایک باب کا عنوان تذکرہ ہے اور ہر ایک باب امام حسین کی زندگی، کرداراور معجزات جیسے موضوعات کااحاطہ کرتاہے-ابواب میں ان لوگوں کے لیے ثواب پر بھی بحث ہے جو غم حسین میں آنسو بہاتے ہیں اور زواری (مقدس مزارات کی زیارت) کو جاتے ہیں-

(Cole, 1989: 224–7)

سید ذیشان ہادی نے اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے لکھاکہ یہ مجلس میں وعظ کے ارتقا پر روشنی ڈالتی ہے اور ایک ٹرانزیشن/عبوری سفر جو شاعری سے مغلوب بیانیوں سے خالص نثری اسلوب کی طرف گیا کا بیان کرتی ہے جسے حدیث خوانی کہاجاتاہے-حدیث خوانی میں سادہ طور پر چند روایات جو ملا باقر مجلسی کی بحارالانوار اور دیگر عربی ماخذ سے ترجمہ کی گئی ہوتی ہیں سنائی جاتی ہیں اور اس کے

فوری بعد شہداء کربلا کے مصائب کا بیان ہوتا ہے۔ جیسے کہ میر اکبر علی رضوی بھی اس طرز کی مجلس خوانی نما وعظ کے ابتدائی بانیوں میں سے تھے ان میں مولانا سید علی صاحب بھی تھے جنھوں نے اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ(1263ھ/1847-1272ھ/1856ء) کے سامنے مجلس میں ایسا ہی وعظ کیا۔

(interview, SMN)

یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ محرم میں عزاداری کا دورانیہ ماہ محرم کے دس دنوں سے بڑھا کر پہلی محرم سے عاشورا کے چالیسویں دن یعنی 20 صفر المظفر تک بڑھا دیا گیا۔ عزاداری کو 40 یوم تک کرنے کا کام ریاست اودھ کے بادشاہ سعادت علی خان(1212ھ/1798ء-1220ھ/1814ء) کے دور میں شروع ہوا۔ اور ناصر الدین حیدر(1242ھ/1827ء-1253ھ/1837ء) کے زمانے میں یہ سرکاری طور پر منایا جانے لگا۔ کیونکہ اس نے اپنی بیماری سے صحت یاب ہونے کی صورت میں ایسا کرنے کی نذر مانی تھی۔

(interview, NM; see also Rizvi, 1986,vol.2:284)

بتدریج سوگ و عزاداری کے ان ایام کو ربیع الاول کی آٹھ تاریخ تک بڑھا دیا گیا۔

برٹش نے جب ریاست اودھ کو زبردستی 1272ھ/1856ء میں اپنے ساتھ ملا لیا تو اس نے ان طاقتوں کی حوصلہ افزائی کی جو شیعی مجالس پر بڑا اثر ڈالنے والی تھیں۔ خاص طور پر انھوں نے جدید مجالس عزا کے خطبوں کی شکل و صورت نکالی۔ برٹش کا یہ اقدام ان واقعات میں سے ایک تھا جس نے 1856-7 کی جنگ آزادی/غدر کے شعلوں کو ہوا دی(1857ء کی جنگ کو جنگ آزادی یا غدر کہنے کا انحصار اس بات پر ہے تاریخ کون مرتب کر رہا ہے)۔ جنگ آزادی 1857ء اس بڑی تحریک کا حصّہ ہے جس نے 90 سال بعد ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کو ممکن بنایا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں کوئی شئے ایسی نہ تھی جس پر اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی تغیرات کا اثر نہ ہوا ہو اور شیعی مجالس کو بھی اس سے استثنا حاصل نہ تھا۔

اودھ کے شاہی دربار کے ختم ہو جانے کا ایک نتیجہ بعد میں یہ نکلا کہ نچلے طبقات کے لیے بھی مجالس کا دروازہ کھل گیا۔ کیونکہ اودھ کے شاہی دربار سے ہی زمیندار اشرافیہ کے سارے نظام کی بنیاد تھی۔ نوابوں اور بادشاہوں کے زمانہ حکمرانی میں، اگرچہ مجالس بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھیں لیکن زیادہ تر کی سرپرستی اشراف کیا کرتے تھے۔ امام باڑے جہاں مجالس عزا کا انعقاد ہوتا مجالس کا شام میں آغاز ہونے سے پہلے کی یاترا کاریگر اور مزدور پیشہ لوگ کر سکتے تھے، لیکن نچلے طبقات جن کو اجلاف (گھٹیا) کہا جاتا تھا مجالس شروع ہونے سے پہلے امام باڑے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

(Mrs Ali, 1917: 27)

مجالس عزا شرف، امارت، طاقت اور مقام و مرتبہ کے اظہار کا ذریعہ بن گئی تھیں۔ محرم کی مجالس و تقریبات دولتمندوں اور غریبوں کے ان گروہوں کا ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا ذریعہ بن گئی تھیں جو امام حسین کا احترام کرتے تھے، لیکن ان مجالس نے ان دونوں طبقات کے درمیان سماجی خط فاصل کھینچنے کا کام بھی کیا۔

(Cole, 1989: 103)

شیعی شاہی دربار کے خاتمے کے ساتھ ہی محرم میں عزادری کی تقریبات میں اشراف کا غلبہ کم ہونا شروع ہوا اور زیادہ بڑے پیمانے پر لوگوں کی شرکت ان میں ہونے لگی۔

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ کتاب خوانی اور زیادہ مقبول ہونی شروع ہوئی جب اسے فارسی کی بجائے مشترکہ زبان اردو میں پڑھا جانے لگا کیونکہ اشراف پہلے فارسی میں کتاب خوانی کیا کرتے تھے۔ اس سے شاعری کی قرآت کے غلبے کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔ مجالس میں شاعری کا غالب کردار مزید کم ہو گیا جب شاعروں کی سرپرستی کرنے والی اشرافیہ کا مقام مرتبہ خود بھی ریاست اودھ کے ختم ہو جانے سے خود بھی زوال پذیر ہو گیا۔ نچلے طبقات کے لیے مجالس عزا کا دروازہ کھلنے کے وقت ہی، 20ویں صدی کے ابتدائی عشرے میں لوگوں کی شرکت بھی تیزی سے بڑھنے لگی تھی۔

مجالس عزا کے اجتماعات کی تعداد میں اضافے کے شاعروں کی تعداد گھٹ جانے کے عمل کے ساتھ ملنے سے ایسے لوگوں کی کمی ہوگئی جو مجالس میں مرثیہ خوانی کرنے کے فن سے واقف تھے- یہ خلا واعظوں/مبلغوں/ذاکروں نے بھرنا شروع کر دیا تھا-

(interviews, NM and MA)

اگرچہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایسا محسوس کیا گیا ہو کہ اودھ میں شیعی رسومات کی شاہی سرپرستی کا خاتمہ اس بڑے پروسس کا حصّہ ہے جس نے وسیع تر سوسائٹی میں شیعہ کا سماج مقام کم کر دیا تھا-

(Cole, 1989: 70)

شیعہ اس وقت کی برصغیر ہند کی کل آبادی کا محض 3 فیصد تھے اور وسیع مسلمان برادری کے اندر ان کی جو حکمران اشرافی اقلیت والی حثیت تھی وہ بدل گئی تھی اور خود مسلمان برادری بھی ہندوستان میں اور کم تر ہوگئی جب ہندوستان ایک سیکولر جمہوری نیشن سٹیٹ بن گیا- ہندوستانی ماہر تاریخ مشیر الحسن اور دیگر نے دکھایا ہے کہ برٹشن نے جزوی طور پر ہندوستانی نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر کو کم کرنے کے لیے مسلمانوں میں ایک، 'مذہبی-سیاسی 'وحدت ہونے کے احساس کو بڑھاوا دیا---------- ایک متحد، مربوط اور س ہندؤں سے بالکل الگ تھلگ مذہبی-سیاسی وجود- وہ کہتا ہے کہ یہ پالیسی کم از کم سن 1906 میۂ مسل م لیگ کی تشکیل کے پیچھے تھی، اور اس نے اس کے لیے جگہ فراہم کی، وہ لکھتا ہے، ہندؤ- مسلم وسیع تر تقسیم کے تناظر میں 'مذہبی شناختوں پر نئے سرے سے زور کے ماحول میں 'شیعہ نے بھی خود اپنی مذہبی شناخت کو بڑھاوا دینے اور اس پر طاقتور انداز میں زور دینے کی ضرورت کا سامنا کیا- جبکہ اب وہ شیعی شاہی دربار اور اشرافیہ کی سرپرستی پر بھی انحصار نہیں کر سکتے تھے- جبکہ سنّی اودھ کی شیعی بادشاہت گرنے سے زیادہ طاقتور ہوگئے تھے تو شیعہ نے بھی اپنی شناخت کو سنّی برادری کے مقابلے میں بڑھاوا دینے کا فیصلہ کیا-

(Hasan, 1997: 35)

(Freitag, 1984: 142)

محرم کے ایام منانے میں فرقہ وارانہ تصادم کی ایک تاریخ پہلے ہی موجود تھی، جیسا کہ ہم بویہ دور میں دیکھ چکے ہیں- شیعہ- سنّی حریفانہ پن دکن کے باہمنی دربار میں 'مقامی- غیر ملکی' مسابقت کا ایک اہم پہلو رہا ہے- ہمارے پاس انیسویں صدی میں ممبئ میں شیعہ، سنّی اور ہندؤں کے درمیان فرقہ وارانہ لڑائیوں کا ریکارڈ موجود ہے-

(Masselos, 1982: 47–67)

فرقہوارانہ تصادم تو اودھ میں بھی موجود تھا- جان کول کہتا ہے کہ یہ تصادم جزوی طور پر اصولی شیعہ عالموں کی طرف سے جو وہ سمجھے تھے کے مطابق اصل شیعی اسلام کیا ہے اور وہ محرم کی رسوم و شعائر جو سنّی اور ہندؤں کے زیادہ قریب تھے کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی کوششوں کا نتیجہ تھا- شیعی رسومات میں سے ہندؤں اور سنیوں کو نکال باہر کرنے سے یہ علماء اپنی طاقت کا ایک مرکز بنانے کے قابل ہوگئے تھے- جیسا کہ جان کول لکھتا ہے، 'بعض شیعی رسومات کی تقسیم کرنے والی نوعیت، خاص طور پر محرم میں اہلسنت کے محترم و مقدس خلفاء سے پر لعنت اور ہندؤں کو محرم کی تقریبات میں شرکت سے روکنے کے عمل نے ابتدائی کمیونل ازم/فرقہ واریت کی نمو کی حوصلہ افزائی کی-'

(Cole, 1989: 93)

سن1338ھ/1919-20میں لکھنؤ میں مدرسۃالواعظین شیعی اسلام کے فاضلین تیار کرنے کے لیے قائم کیا گیا-

(Rizvi, 1986, vol. 2: 157)

اس مدرسے میں جہاں مبلغ تیار ہوتے وہیں یہاں پر مجلس خوانی کی تربیت بھی دی جاتی تھی-یہ مدرسہ آج بھی قائم ہے- مجلس ہمیشہ سے شیعہ کے درمیان اہم ترین رسومات سے ایک رہی ہے جس کی بنیاد کربلا کی اجتماعی یادداشت پر ہے اور اس پر شیعہ کا اصرار اپنی الگ اور ممیز شناخت کو ابھارنے کے لیے رہا ہے- مجلس کے اس کردار کو اور بھی طاقتور شیعہ برادری کے مذہبی رہنماؤں نے کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ وہ منبر کو اب محض واقعہ کربلا بیان کرنے کے لیے استعمال نہیں کر رہے تھے بلکہ توسیع شدہ کلامیوں/ڈسکورسز میں اس کو شیعی شناخت کو مستحکم کرنے کے لیے بھی استعمال کر رہے تھے-

جدید خطبہ عزا

جدید خطبے کی پیدائش کوئی نیا مظہر نہیں تھی جیسا کہ ہم نے قاچاری عہد کے ایران کے میں اور قطب شاہی عہد کے حیدرآباد میں عزاداری کی تقریبات کے بیان میں دیکھا کہ کیسے ان زمانوں میں محرم میں عزاداری کی تقریبات میں فی البدیہہ خطبے ہوا کرتے تھے-

ممبئی میں1820ء تک، محرم کی تقریبات زیادہ تر کونکانی سنّی مسلمان ہی بپا کیا کرتے تھے- 1860ءیں ان میں سے کئی ایک سنّی گروہ اپنی مساجد میں پانچ خطبوں کی سیریز میں واقعات کربلا کی یاد مناتے تھے جو زیادہ تر رات کو (بعد از نماز عشاء) دیے جاتے تھے-اس رواج پر ممبئی کے مقامی شیعہ (فارسی نژاد شیعہ مہاجرین کے برخلاف) بھی عمل کرتے تھے- جبکہ فارسی نژاد شیعہ مہاجرین بڑے عوامی روایتی جلوس عزاداری کی بجائے ایسی مجالس کو ترجیح دیتے تھے جو عزاداروں کے باہم حریف گروپوں میں متشدد محاذ آرائی کی طرف لیجایا کرتی تھی-

(Masselos, 1982،56–7)

سن1870ء میں جنوبی ہندوستان کے اندر ہم مدراس میں مجلس کا ایک دوسرا بیان پاتے ہیں، جس میں امام حسین علیہ السلام کے فرزند علی اکبر ابن حسین کے مصائب کے بیان کے ساتھ فی البدیہہ/برجستہ خطبہ بھی شامل ہوا کرتا تھا-

(Gover, 1872: 166)

تاہم اودھ میں مجلس عزا کے وعظ میں ایک نیا پہلو بھی تھا، اور وہ یہ تھا کہ اس وعظ میں نہ صرف فضائل و مصائب شہداء کربلا و بزرگان شیعہ دیگر بیان کیے جاتے بلکہ اس میں دوسرے موضوعات بھی شامل کر لیے جاتے- فضائل و مصائب اب بھی شامل تھے، لیکن مصائب کو خطبے کے آخر میں الگ سے جگہ دی گئی اور شروع میں ایک کلامیہ/تقریر کا اضافہ کر دیا گیا-اس پہلو کے اضافے نے مجلس عزا کے خطبے کی ساخت دو جزئی کر دی تھی: پہلے جزو میں عام تقریر ہوتی اور اس کے ساتھ فضائل کا بیان ہوتا اور دوسرے حصّے میں مصائب بیان کیے جاتے تھے- یہ رواج آج بھی قائم و دائم ہے-

(Interview, SMN)

اودھ میں مجلس عزا کے جدید خطبے کی ساخت اور مقصد پر مرثیہ بھی اثرانداز ہوا جو ہمیشہ سے مجلس سے جڑا رہا تھا۔ روایتی مرثیہ کی ساخت اور مواد بہت واضح رہا ہے جو سخت گیر یا لچک دار انداز میں شاعر کی دین ہوتا ہے-وسیع تناظر میں ایک مرثیے کا ہمیشہ آغاز تمہید سے ہوتا ہے جس میں عمومی طور پر حمد بیان ہوتی ہے، نعت کہی جاتی ہے اور پھر قصیدہ در بارگاہ علی المرتضیٰ علیہ السلام پیش کیا جاتا ہے اور پھر جس کے لیے مرثیہ کہا جا رہا ہوتا ہے اس کے فضائل کو عیاں کیا جاتا ہے، اس کی شہادت کو بیان کیا جاتا ہے-اور پھر اس شہید کے اہل بیت کی عورتوں کے اس کی شہادت پر کہے گئے کلمات عزا کو منظوم پیش کیا جاتا ہے اور اختتام دعائے شفاعت پر ہوتا ہے- 35

میر انیس کے مرثیوں میں سے ایک مرثیے کے آخری بند کا مصرعہ ہے

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری

میر انیس اس کے بعد اس مرثیے کے لکھنے کی غایت بیان کرتے ہیں:

دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو

دل بھی محفوظ ہوں، رقت بھی ہو تعریف بھی ہو36

یہاں یہ نوٹ کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اس فریم ورک کے ساتھ کس قدر آج کا جدید مجلس عزا کا خطبہ ہم آہنگ ہے، جیسا کہ ہم حصّہ دوئم میں خطبات مجالس سے اس کی مثالیں بھی پیش کریں گے-

تو خطبات مجالس عزا میں جو مرکزی موضوع ہے وہ ہے پہلے برکت سے شروع ہوتا ہے جس میں کم از کم کسی ایک شہید کربلا کے فضائل اور پھر مصائب بشمول شہید اور رشتے دار خواتین کے باہمی مکالمے، تذکرہ شہادت اور پھر آخر میں دعائے توسل ہوتی ہے-37

اودھ کے نئے کلامیوں/ڈسکورسز میں ایک غالب تصور جس کی تبلیغ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں کی جانے لگی اور اسے شیعی نظریہ کو خاص طور پر ابھارنے کے لیے استعمال میں لایا گیا وہ تھا مناظرہ-اور عام طور پر شیعی سیاق وسباق میں مناظرے کا مطلب سنّی اسلام کے خلاف دلائل پیش کرنا ہوتا تھا۔

(interview, SMN)

مناظرہ آغاز سے ہی شیعہ کلامیہ /ڈسکورس کا جزو تو تھا لیکن اب یہ تبلیغی انداز لیے ہوئی جدید مجلس کا جزو لازم بھی بن گیا تھا۔ دو شیعہ مبلغ جو انسیوین صدی کے آخر میں سر گرم تھے مولانا محمد حسین اور مولانا رضا صاحب فاضل تھے جو اپنے مناظرانہ خطبات کی وجہ سے مشہور تھے۔

(Interview, MA)

اسی طرح ایک مجلس عزا کے مبلغ تھے جو سنّی سے شیعہ ہوئے تھے اپنے سنّی مخالف مناظروں کے سبب مشہور تھے بیسویں صدی کے آتے آتے اور وہ تھے مولانا مقبول احمد۔ وہ ایسے شیعہ عالم تھے جنھوں نے قرآن پاک کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مقبول احمد نے حیدرآباد کے دورے بھی کیے تھے، اور بعض لوگوں کا کہنا ہے وہ جدید مجلس خوانی کرنے والے پہلے عالم تھے۔

(interviews, MJR and ZH)

جس شخص کا نام سب سے زیادہ جدید مجالس خوانی کو مقبول بنانے میں لیا جاتا ہے وہ مولانا سبط حسن نقوی جائسی (1296ھ/1888ء-1354ھ-1935ء) تھے۔ جیسے ہی مجالس تمام طبقات کے لوگوں کے لیے کھل گئیں تو انھوں نے اس نئے مجمع کے لیے اپنی خطابت کی کانٹ چھانٹ کی۔ علماء کی مفرس (فارسی زدہ) اردو کی بجائے اور واقعہ کربلا کا بیان فارسی میں کرنے کی بجائے (جیسا کہ اس وقت تک واقعہ کربلا کا بیان فارسی میں ہوا کرتا تھا) سبط حسن نقوی نے اردو زبان کا وہ محاورہ اختیار کیا جسے عام لوگ سمجھ سکتے تھے اور اس سے اپنے آپ کو جوڑ سکتے تھے۔ وہ اسقدر طاقتور خطیب تھے کہ اپنے موضوع تقریر سے لوگوں کو جوش وجذبے کے ساتھ جوڑ سکتے تھے۔ لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں مولانا مصائب پڑھ رہے تھے تو انھوں نے امام حسین کا کربلا میں کہا گیا قول پڑھا، 'کون ہے جو میری مدد کرے گا؟' تو یہ جملہ اس قدر پراثر انداز میں ادا کیا گیا تھا کہ مجلس میں بیٹھا ایک آٹھ سال کا عزادار کھڑا ہو گیا اور چلایا، "میں آپ کی مدد کروں گا۔'

(Interview, HKN)

دوسرے مبلغین جو مولانا سبط حسن نقوی جائسی کے معاصرین تھے ان میں مولانا محمد رضا شمسپوری اور حکیم مرتضی علی الہ آبادی تھے۔

جے این ہولیسٹر نے 'سروے آف شیعی اسلام ان انڈیا' 1940ء کے اوائل میں لکھی۔ اس میں وہ لکھنؤ میں محرم کی تقریبات کا سارا بیان کرتے ہیں۔ یہ تفصیلات ان تک ان کے ایک شیعی دوست نے فراہم کیں اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ تفصیلات اس کتاب کے لکھنے کے زمانے کی ہی ہیں۔

اپنے بیان میں وہ لکھتا ہے کہ جب اہل بیت کے مزارات کے رپلیکا جن کو تعزیے 38 کہا جاتا تھا جب خصوصی عمارتوں یا کمروں میں رکھ دیا جاتا تو ساتھ ہی وہاں پر ایک منبر بھی رکھا جاتا تھا۔ مجالس بارے بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے، 'بڑے اجتماعات مجالس میں خصوصی تربیت یافتہ افراد کو بعض اوقات اس یوم کی خصوصیت سے تاریخ کے مخصوص حصّے کے بیان کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ ایک خطبہ بھی دیا جاتا۔ اس کے بعد مراثی کی باری آتی جس کی قرآت میں مجمع سے لوگ بھی شامل ہو سکتے تھے۔"

(Hollister 1988: 170)

اس سرگزشت سے یہ نظر آتا ہے کہ 1940ء میں روضہ خوانی یا کتاب خوانی تب تک مجلس میں ہوا کرتی تھی اور یہ اس وقت بھی ہوتی تھی جب مبلغین کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خطبے مجالس میں اتنے اہم نہیں ہوتے تھے جتنے یہ بعد میں بن گئے۔ یہ دیکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ 'خطبہ' جس کے بارے میں ہولیسٹر نوٹ کرتا ہے کہ اس نے کتاب خوانی کی جگہ نہیں لی تھی بلکہ وہ مجالس میں ایک اضافی شئے تھی۔ ہولیسٹر کے مشاہدات کی تصدیق وہ لوگ بھی کرتے ہیں جنھوں نے اس زمانے میں اپنے بچپن میں لکھنؤ میں مجالس میں شرکت کی تھی۔

(Interview, DS)

انیسویں صدی کے وسط میں جن مبلغین مجالس عزا کو یادر کھا جاتا ہے وہ ہیں:

مولانا کلب حسین جن کا تعلق مولانا دیدار علی شاہ کے ممتاز گھرانے سے تھا جو کہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے 1943ء-4تک صدر رہتے تھے-مولانا سید علی نقی المعروف نقن صاحب(1316ھ/1898ء-1377ھ/1958ء)جو کہ لکھنؤیونیورسٹی میں لیکچر رتھے پھر وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ شیعی تھیالوجی کے چیئر مین تھے-نقّن صاحب کے بارے میں کہا جات ہے کہ انہوں نے 13 سال کی عمر میں مجلس پڑھنا شروع کردی تھی-ایک صاحب عزت آدمی جس سے میں نے بات کی،اسے ان کے کچھ خطبات یاد تھے۔اس نے مجھے بتایا کہ مولانا دس روز ایک ہی موضوع پر بول سکتے تھے،مثال کے طور پر جیسے ظلم ہے-اس موضوع کی سریز میں مولانا کہتے،'اسلام نے پہلے زراعت،پھر تجارت اور پھر سروس انڈسٹری کو ترجیح دی کیونکہ اس قسم کے معاشرے ظلم کی سیڑھاں بتدریج جڑھنے کا رجحان رکھتے ہیں-39 دیگر مجلس پڑھنے والوں میں مولانا ابن حسن نونہروی(1317ھ/1899-1400ھ/1980ء)،ان کے حریف مولانا حیدر مہدی زیدپوری،مولانا محمد مہدی زیدپوری اور مولانا محسن نواب جو محسن الملت بھی کہلواتے تھے شامل تھے-

(Interview, SMN)

ایک دلچسپ حکایت مولانا سید احمد دہلوی کے بارے میں مجھ سے بیان کی گئی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مجلس عزا خاموشی سے محض ہاتھ کے اشاروں سے موثر طریقے سے پڑھا کرتے تھے-

(Interview, HKN)

شمالی ہندوستان کے بہت سے مجالس پڑھنے والے علماءوذاکرین 1950ء کے وسط میں حیدرآباد دکن مجالس پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے-ان میں "نقنّ صاحب'،ابن حسن نھروی اور مولانا اولاد حسین لالن جو اصل میں رام پور کے ایک ماہر تاریخ تھے بھی شامل ہیں-

معاصر مجالس کا ایک ممتاز وصف ایسے مجالس پڑھنے والوں کا ہے جنھوں نے مجلس خوانی کی باقاعدہ تربیت نہیں لی اور علمائے جعفریہ سے ان کو سند نہیں ملی ہے-ایسے مجلس خواں عام طور پر ذاکر کہلاتے ہیں-قرون وسطی کے حیدرآباد دکن میں ان کو روضہ خواں کہا جاتا تھا-لیکن ابتدائی مجالس خواں جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا وہ سب کے سب علماء تھے-اس لیے یہ دیکھنا بہت اہم ہے کہ کب اور کیوں "،عام لوگوں "نے منبر پر آکر فی البدیہہ کلامیوں کے ساتھ مجلس خوانی شروع کی؟

ابتدائی غیر علماءذاکرین میں سب سے پہلی شخصیات عورتیں تھیں-عورتوں کو عام طور پر رسمی مذہبی تربیت نہیں دی جاتی تھی،اور وہ اس لیے مستند عالم بھی نہیں بن پاتی تھیں-

(Momen, 1985: 245, n. 5, p. 343)

لیکن وہ پھر بھی خواتین کی مجالس میں کم از کم ابتدائی انیسویں صدی سے کتاب خوانی کر رہی تھیں-جیسا کہ ہم دکھا بھی چکے-

سن 1930ء کے آخر میں کتاب خوانی کرنے والی لکھنؤ میں تین عورتیں بہت معروف تھیں-ان کے نام مصطفی بیگم زکریا بیگم اور تقیہ بیگم تھے-اگرچہ یہ عورتیں صرف کتاب سے پڑھ کر مجلس خوانی کرتیں،وہ پھر بھی کم از کم 500 عورتوں کے اجتماع میں مجلس پڑھا کرتیں جن میں مجلس کا اہتمام کرنے والی خواتین کی خاندان،دوست گھرانوں کی عورتیں شامل ہوا کرتی تھیں- مجالس عزا کا اہتمام بہت سی سنّی عورتیں بھی کرایا کرتی تھیں-مجلس کے بعد تبرک اور نیاز تقسیم کی جاتی تھی-40

سن 1940ء یا 1941 میں فتح پور لکھنؤ سے ایک خاتون ذاکرہ محمودہ باقر نے اپنے خطبات مجالس میں فی البدیہہ کلامیے شامل کرنے کا آغاز کر دیا تھا-وہ ہندوستان کی 1947ء میں پاکستان اور انڈیا میں تقسیم کے وقت کراچی ہجرت کرنے سے پہلے فتح پور اور لکھنؤ کی معروف ذاکرہ بن گئی تھیں- وہ کراچی میں اپنی وفات کے وقت تک مجالس پڑھتی رہیں-ان کی وفات 1969ء میں ہوئی تھی-محمودہ باقر کسی نواب گھرانے سے نہیں تھیں لیکن وہ سید زادی تھیں-اگرچہ وہ باقاعدہ کسی مذہبی ادارے سے فارغ التحصیل نہ تھیں لیکن انہوں نے گھر پر ہی قرآن پاک،احادیث،اردو ادب اور روزمرہ کے فقہی مسائل کی تعلیم حاصل کی تھی-اگرچہ میں تیقن سے یہ بات معلوم نہ کر سکا کہ آیا وہ شہدائے کربلاء کے مصائب کی کہانی سے کہیں زیادہ وسیع موضوعات پر اپنے خطبات ارشاد کیا کرتی تھیں یا بس واقعات کربلا کے بیان تک اپنے کلامیوں کو محدود رکھا کرتی تھیں- لیکن یہ فرض کرنا قرین عقل ہے کہ وہ واقعات کربلا کے بیان تک مجلس خوانی کو محدود نہیں رکھا کرتی ہوں گی کیونکہ اس وقت تک علمائے اہل تشیع کے ہاں مجلس خوانی واقعات کربلا کے بیان کے ساتھ ساتھ دیگر معاملات پر کلام کرنے کا ذریعہ خوب اچھے سے بن چکی تھی-

ایک اور معروف اوائل ذاکرہ بی بی بیگم نادر جاہ تھیں جو فی البدیہہ مجالس 1960ء کے اوائل میں کانپور شہر میں پڑھا کرتی تھیں-ان کے والد ایک عالم تھے جن کا نام انور حسین تھا-نادر جاہ ایک جانی پہچانی نوحہ خواں بھی تھیں- 60ء کے عشرے سے بہت ساری ذاکرہ عورتیں مجالس پڑھنا شروع ہو گئی تھیں،بعض اوقات وہ عشرہ مجالس پڑھنے اپنے شوہروں کے ساتھ بیرون شہر جایا کرتی تھیں،جیسے تاج سالطانہ مولانا کلب صادق کی اہلیہ جایا کرتی تھیں-

آصف جاہ (1720-1948) کے دور میں حیدرآباد دکن میں مجالس عزا میں تقریر کا چلن

شمالی ہندوستان میں ہم نے مجلس کے ارتقاء پر سب سے پہلے نظر اس لیے ڈالی تھی کیونکہ یہ اودھ تھا جہاں مجلس میں جدید خطبہ کی پیدائش ہوئی اور آج کی جو مجلس میں خطبے کی جو شکل ہے اس کی پرداخت بھی یہیں اودھ میں ہوئی تھی-اب ہم اپنی توجہ واپس جنوبی ہندوستان میں دکن کی طرف کرتے ہیں اور شیعی قطب شاہی سلطنت کے مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست کھا جانے کے واقعات کے بعد کی تاریخ کو لیتے ہیں-قطب شاہی سلطنت پر اورنگ زیب نے فتح 1099 ھجری/1687ء میں پائی تھی-

اگرچہ شمالی ہندوستان تھا جس نے مجلس خوانی کے ارتقاء کو آگے بڑھانے میں سبقت حاصل کی لیکن حیدرآباد نے بھی مجالس میں خطبات کے ارتقاء کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا-آصف جاہی دور میں مجالس کے جو خطبات ہیں وہ معاصر خطاب مجالس کے آثار قدیم ہیں جن پر ہم نظر ڈالیں یہ ابتدائی مجالس بارے ہماری تحقیق کو اہم بنائیں گے-

اورنگ زیب نے دکن کو مغلیہ سلطنت کا اگرچہ حصّہ بنالیا تھالیکن محض 33 سال ک بعد یعنی سن 1132 ھجری/1720ء میں یہ پھر ایک آزاد سلطنت بن گئی- نئے آصف جاہی حکمرانوں کے دور میں، جنھیں نظام کہاجاتا تھا، شیعہ کی قسمت کسی خاص حکمرکن کی ان سے ہمدردطبعیت کے مطابق ہچکولے کھاتی رہی- پہلے نظام کے زیر حکومت حیدرآباد شہراور محرم میں شیعہ تقریبات سیٹ بیک کا شکار ہوئیں- ایک تو شہر ریاست دکن کے صدر مقام کے درجے سے محروم کر دیا گیا- نظام اورنگ آباد سے گورنری کرتا رہا- محرم کی تقریبات شاہی سرپرستی سے محروم ہو گئیں- اکثر عاشورہ خانے بند کر دیے گئے- شیعی اذان پر پابندی لگادی گئی- تاہم دوسرے نظام، میر نظام علی خان (1175ھ/1762ء-1218ھ/1803ء) نے شاہی عاشورہ خانہ دوبارہ کھول دیا اور بہت سی پرانی محرم کی رسومات کو پھر سے جاری کر دیا- اس کے دور میں، ایک نواب مھدی اقبال جو شمالی ہندوستان سے آئے تھے، انھوں نے شہر میں محرم منانے کی خوب حوصلہ افزائی کی- وہ دکن میں مرشد آباد بنگال سے 1757ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد آیا تھا، جب انگریز فوج نے بنگال کے شیعی نواب سراج الدولہ کو شکست دے دی تھی۔ نواب مہدی اقبال نے حیدرآباد میں مکین ہونے کے بعد اپنے گھر میں عاشوراخانہ تعمیر کیا جو آج بھی موجود ہے- اس کے خاندان کے کئی افراد نے مقامی شیعہ برادری کے عالم اور رہنماء کے طور پر فرائض بھی ادا کیے ہیں-

(interview, MMA)

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں، حیدرآباد میں محرم بارے ایک بیان میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت مجالس میں زیادہ تر مرثیہ خوانی اور کتاب خوانی کا غلبہ ہوا کرتا تھا- خواجہ غلام حسین خان نے 'تاریخ گلزار آصفیہ' (جو 1266ھ/1844ء میں مکمل ہوئی) لکھا ہے کہ یکم محرم سے دس محرم تک، چند لوگ تذکرہ مصائب کربلا سنانے کے لیے ہائر کیے جاتے، بلکہ دوسرے خود بھی ان کہانیوں کو پڑھا کرتے تھے- لیکن یہ بیان ان کتب کی قرآت سے زیادہ محرم میں میلے ٹھیلوں کی فضا پر زیادہ فوکس رکھتا ہے-

(Quoted in Rizvi, 1986, vol. 2: 342)

چوتھے اور پانچویں آصف جاہی نظام حاکموں کے ادوار میں، شیعہ کی قسمت پھر زوال پذیر ہونا شروع ہو گئی اور یہ پانچویں نظام، افضل الدولہ (1273ھ/1857ء-1286) کے دور تک جاری رہی- چوتھے نظام نے اپنے دور حکومت کے آخری سالوں میں شمالی ہندوستان کے ایک شیعہ نواب، سر سالا جنگ اول کو اپنا وزیر اعظم بنالیا تھا جس نے بعد میں آنے والے تین حکمرانوں کے ساتھ 30 سال تک اس عہدے پر کام کیا- اور اس نے حیدرآباد میں سب سے زیادہ شیعہ مسلمانوں کی تقدیر سنوارنے کے معاملے میں زمہ داری کا مظاہرہ کیا- اس نے ریاستی نوکر شاہی کے ڈھانچے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لیے ایک نئی ایڈمنسٹریٹر کلاس حیدرآباد میں لا کر بٹھائی۔ اس طبقے کے لوگ برطانوی ہند میں تربیت پائے ہوئے تھے اور خاص طور پر یہ نئے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ سے تربیت پائے ہوئے تھے جسے سر سید احمد خان نے 1292 ھجری/1875ء میں بنایا تھا- اس طبقے میں کئی ایک شیعہ مسلمان تھے- 41 ٹاپ ایڈمنسٹریٹو/ بالائی انتظامی عہدے باہر سے آئے لوگوں کو دینے کے عمل نے حیدرآباد کے مقامیوں اور باہر سے آنے والے غیر مقامیوں میں بے چینی پیدا کر دی- باہر سے آنے والے غیر مقامیوں نے شہر میں ایک سماجی گروہ تشکیل دیا جو سالار جنگ اول کی موت کے بعد 1300 ھجری/1883ء میں سیاسی طور پر غالب گروہ بن گیا-

(Leonard, 1978a: 128–30; see also Leonard, 1978b)

سالار جنگ اول حیدرآباد کی نوکر شاہی میں شیعہ افسران ہی لیکر نہیں آیا بلکہ وہ 1276ھ/1860ء میں ایک شیعی عالم آیت اللہ سید نیاز حسینی کو نجف سے لیکر حیدرآباد دکن آیا- عالم نے شیعہ برادری کی سماجی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کے لیے سخت محنت کی- اس نے وہاں اپنی سرکاری رہائش کے، قب میں پر شیعی مسجد 'مسجد اثناء عشری' تعمیر کروائی- یہ بھی کہاجاتا ہے کہ قطب شاہ سلطنت کے زوال کے بعد انھوں نے ہی حیدرآباد میں پہلی بار شیعہ اذان دی- اور 19 رمضان المبارک 1276ھ/1860ء کو حضرت علی کی شہادت پر پہلی بار شیعہ دعا بھی اعلانیہ پڑھی-

42سن 1886ء سے پہلے حیدر آباد میں شیعہ مسلمانوں کی تعداد بارے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں لیکن 1886ء میں حیدر آباد شہر میں 6217 شیعہ مسلمان درج تھے اور یہ حیدر آباد شہر میں کل آبادی کا 96۔7 فیصد بنتے تھے۔ مسلمانوں کی کل آبادی اس وقت حیدر آباد شہر میں 78،000 تھی۔43اس جاگیر داری نظام میں سماج انتہائی سخت قسم کی درجہ بندی کے نظام پر مشتمل تھا۔ اشراف کے بعد جن سماجی مراتب کو مسلمان برادری میں بلند مرتبے سمجھا جاتا تھا ان میں شیعہ مسلمانوں کا ایک طبقہ بھی شامل تھا اور ان مراتب میں اہل سیف (جن میں پولیس اور فوج شامل تھے)، اہل قلم (جن میں کلرک/منشی اور سول ایڈمنسٹریٹر شامل تھے) کے مراتب تھے۔ جبکہ نچلے طبقات میں عام طور پر مزدور یا اشراف کی رعایا شامل ہوتے تھے۔

(Khalidi, 1991: 10)

اگرچہ آیت اللہ نیاز حسین کے تیسرے اور چوتھے بیٹے نے والد کی وفات کے بعد ان کے کام کو جاری رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے تیسرے بیٹے حجۃ الاسلام سید احمد رضا حیدر آباد میں عزاداری کے روح رواں تھے۔

(Wafâ, 1978: 99)

سید احمد رضا اور ان کے چھوٹے بھائی نے محرم کے پہلے نو دنوں میں شہر کے ہر ایک علاقے میں مجالس کے ایک دورے کی بنیاد رکھی۔ فجر کی نماز کے بعد شہر کے شیعی علاقوں کو آپس میں بانٹ کر دونوں بھائی گھر گھر جاتے اور اس دورے کا اختتام شام میں نماز مغرب کے وقت ہوتا تھا۔

(Interview, ZH)

اگرچہ آیت اللہ نیاز حسین کے تیسرے اور چوتھے نمبر پر آنے والے بیٹوں نے بھی حیدر آباد میں عزاداری کی رسم کو دوبارہ جاری کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تھا لیکن یہ ان کے دوسرے نمبر پر آنے والے بیٹے سید ابوالحسن (پیدائش 1285ھجری/1868ء) المعروف میراں حسن تھے جن کا حیدر آباد میں تبلیغی مجالس عزا کی ترقی میں سب بھائیوں سے زیادہ کردار ادا کیا۔ نجف اشرف سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وہ مجتہد بنکر حیدر آباد لوٹے۔ میں بالکل درست وقت کا تعین تو نہیں کر سکا کہ کس زمانے میں انہوں نے مجالس سے خطاب کرنا شروع کیا لیکن یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے شاید انہوں نے یہ تبلیغ 19ویں صدی کی ابتداء سے شروع کی ہو گی۔ وہ مجالس عزا میں جس قسم کے خطبے دیا کرتے وا واعظانہ ہوتے تھے۔ اور ان کی پڑھی جانے والی مجالس کو "مجالس مواعظہ" کہا جاتا ہے۔ اور ان کے خطبات کے موضوعات "گناہ"، "جزاو سزا" اور "جہنم" ہوا کرتے تھے۔ نظام ہفتم میر عثمان علی خان (1911-48) ان کی باقاعدگی سے مجلس سننے والون ہیں شامل تھے۔ میراں صاحب کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ ایک بار ان کے والد خدا کی طرف سے گناہگار امراء کو سزا کے طور پر جہنم بھیجنے کے موضوع پر تفصیل سے خطاب کر رہے تھے تو میر عثمان جو وہاں موجود تھے اور دنیا کے سب سے امیر آدمی خیال کیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے شیعی وزیر کو اشارہ کیا کہ وہ مولانا سے جلدی کرنے کو کہیں اور تقریر ساعت کریں۔ مولانا اس پر برہم ہو گئے اور کہنے لگے کہ لوگ مجلس میں آتے ہی کیوں ہیں اگر انہیں اللہ کا پیغام سننا ناگوار گزرتا ہے۔ اس کے بعد نظام ہفتم نے مولانا کا خطبے کے لیے شکریہ ادا کیا اور اپنے لیے دعاؤں کی درخواست کی۔

(Interview, ZH)

حیدر آباد میں مجالس تبلیغ پڑھنے والا ایک اور اہم خانوادہ مجتہد سید غلام حسین کا تھا جو حیدر آباد آنے سے پہلے چالیس سال نجف اشرف میں رہے۔ انھوں نے مشرقی افریقہ میں شیعہ اثناعشری اسلام کو پھیلانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(See Momen, 1985: 279)

سید غلام حسین جدید شیعی مجالس کے اولین مقرروں میں بھی شمار کیے جاتے تھے۔44ان کا خاندان حیدر آباد سے قطب شاہی سلطنت دور سے جڑا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے مولانا سید نثار حسین (1894-1952) المعروف آقا بھی حیدر آباد آنے سے پہلے مجتہد تھے۔ انہوں نے جنوبی ہندوستان کے دورے کیے اور ساتھ ساتھ اپنے والد کی طرح جنوبی افریقہ کے دورے بھی کیے۔ اور

خاص طور پر تبلیغ میں مصروف رہے۔ سید آقا کے بیٹھے، رضا آغا آج کل حیدر آباد میں سب سے زیادہ بااثر عالم ہیں۔ تیسری صف میں جو علماء حیدر آبادی مجالس پڑھنے کی تاریخ میں جگہ بناپاتے ہیں ان میں مولانا محمد علی کا خاندان بھی شامل ہیں جنھوں نے شیعی مسجد جعفری بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ محرم منانے کے لیے جو بنیادی پیش ہائے رفت ہوئیں وہ پہلے شمالی ہندوستان میں ہو چکی تھیں۔ حیدر آباد تو ان کی بس پیروی کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر 1287ھ/1870ء میں معروف مرثیہ گو شاعر میر انیس اپنی شاعری سنانے حیدر آباد آئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سارے حیدر آبادی شاعر شمالی ہندوستان کی طرز پر مرثیہ کہنے لگے۔ اگرچہ جنوبی ہندوستان میں از منہ وسطی سے ہی اردو کی ایک خاص شکل، جسے دکنی جاتا تھا رائج تھی، لیکن 19 ویں صدی میں، شمالی ہندوستانی اردو معیار بن گئی اور اس نے دکنی اردو کا صفایا کر دیا۔

(Interview, SN)

انیسویں صدی کے آخر میں لکھنؤ میں شیعہ مدرسے کے فارغ التحصیل حیدر آباد اور دوسرے علاقوں میں پھیل گئے کیونکہ مدرسہ بند ہو چکا تھا۔ انھوں نے وہاں شمالی ہندوستان میں رائج نصاب متعارف کرایا۔

(Cole, 1989: 289)

دکن میں مسلمان برادری کا ایک خاص اور ممتاز وصف جو شمالی ہندوستان کے اثر سے بچ نکلا تھا وہ شیعہ اور سنّی مسلمانوں کے درمیان اچھے تعلقات تھے۔ عمر خالدی اس مظہر کا جزوی سبب صوفی نظریہ تفضیل علی علیہ السلام تھا۔ (صوفی بزرگوں میں ایسے بہت سارے صوفی تھے جو حضرت علی علیہ السلام کی بعد از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب پر فضیلت کے اعتبار سے برتری کے قائل تھے) تو جناب علی المرتضی علیہ السلام کی مدح سرائی کبھی بھی صرف شیعہ مسلمانوں کی صوابدید نہیں سمجھی گئی۔ حقیقت امر یہ ہے کہ گزشتہ 600 سال میں دکن میں سنّی۔ شیعہ لڑائی انتہائی کم ہوئی۔

(Khalidi, 1991: 8–9)

اس امر کی ایک وجہ لازمی یہ بھی تھی کہ دکن میں محرم کو، جیسا کہ ہم قطب شاہی حکمرانوں کے دور میں دیکھتے ہیں ریاستی سرپرستی حاصل تھی تاکہ ایک مشترکہ مذہبی ثقافت جنم پاسکے جس میں ہندؤ اور سنّی مسلمان بنا اپنے ممتاز عقائد کو ترک کیے شریک ہو سکیں۔ مثال کے طور پر پہلے تین خلفاء سے بیزاری جو کہ تبرا کا حصّہ ہے، اسے 1921ء میں سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔ بہت سارے اشراف ہندؤ خاندان آصف جاہی دور میں محرم کی رسومات کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ کیونکہ عزاداری دربار میں بہت مقبول تھی۔ کئی ایک اشراف منت پوری کرنے کے لیے محرم کی رسومات کی سرپرستی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر راجا رمبھا، ایک ہندؤ راجا تھے، انہوں نے منت مانگی کہ اگر ان کے ہاں اولاد نرینہ ہوئی تو وہ محرم منائیں گے۔ اور پھر ان کے ہاں لڑکے کی ولادت ہوئی اور انھوں نے اپنی منت پوری کی۔45

شیعی مجالس کے خطبات کی ترقی میں ایک اہم کردار حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی نے ادا کیا جو سن 1918ء میں بنی تھی۔ اس یونیورسٹی کے ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی الہ آباد جو شمالی ہندوستان کا حصّہ ہے جو 1920ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے یونیورسٹی بنی تھی نے بھی ایک تعلیم یافتہ شیعہ طبقہ جنم دینے میں مدد کی جو مجالس کی قدیم شکل کے ساتھ مطمئن نہیں تھا، جس میں صرف شہدائے کربلا کے مصائب کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم نے اس شیعہ طبقے کے اندر تیزی سے بدلتی ہوئی ما قبل آزاد ہندوستان کی دنیا کے اندر اپنے مذہب کے بارے میں دانشورانہ سطح پر اور زیادہ آگاہی کی خواہش کو جنم دیا۔ یونیورسٹی کی تعلیم نے مجلس خوانی کرنے کے لیے پرانے علماء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے اگاہی کو بھی ضروری جانا اور اس نے اس مانگ پر پورا اترنے والے مجلس خواں جنم دیے۔ دو خاص اشخاص جن میں ایک مرد تھا اور ایک عورت جو اس معیار پر پورا اترے عثمانیہ یونیورسٹی سے پڑھے تھے۔

مردوں میں پہلے معروف مجلس خواں سارے ہندوستان میں جو علماء میں سے نہیں حیدرآباد سے رشید ترابی تھے۔وہ فلسفہ میں ماسٹرز تھے اور خطابت میں قابل ذکر مہارت رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی خطیبانہ مہارت کا استعمال صرف منبر سے ہی نہیں کیا بلکہ ان ہنگامہ خیز واقعات کے دوران بھی کیا جو ہندوستان کی تقسیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور حیدرآباد دکن ریاست کو زبردستی نئے آزاد ہونے والے ملک ہندوستان میں ضم کردیا۔آزادی کے بعد، وہ پاکستان ہجرت کر گئے جہاں وہ 1950ء میں اپنی وفات تک مقیم رہے۔ان کی تقریریں اکثر خاص تصورات اور نظریات کے اجمال کی تفصیل ہوا کرتی تھیں۔خاص طور پر قرآن اور نہج البلاغہ سے وہ استفادہ کرتے۔مثال کے طور پر وہ رزق اور دعا جیسے موضوع پر تقریر کرتے تو کئی مجالس میں اپنے موضوع کو کھول کر بیان کرتے۔انھوں نے ایسے ہی مجالس کے تیس روزہ سلسلے میں سورہ یاسین کی تفسیر و تشریح بیان کی جو بہت مقبول ہوئی۔سورہ یاسین قرآن کریم کی بہت اہم سورہ ہے۔اور اکثر قریب المرگ شخص کے حالت نزع کے وقت بطور تلقین پڑھی جاتی ہے۔دوسرے اہم غیر عالم ذاکر، طاہر جرولی تھے جو قانون دان تھے، اقبال زیدی تھے جو آرٹس میں گریجویٹ تھے۔اور ایسے ہی مہدی سن تھے۔جبکہ غیر عالم اولین ذاکروں میں سے لکھنؤ کے اندر فیروز حیدر تھے۔

(Interview, SH)

جس وقت شمالی ہندوستان میں عورتوں نے فی البدیہہ کلامیہ کے ساتھ مجلس خوانی شروع کی تھی تو اسی وقت میں ہندوستان میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ابتدائی مجلس خواں عورتوں میں جنھوں نے پرانے انداز کتاب خوانی کو ترک کردیا تھا لطیف النساء۔وہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔اردو میں ایم اے تھیں اور انہوں نے ایک اونچے مرتبے کے تعلیمی ادارے "محبوبیہ اسکول" میں پڑھایا بھی تھا۔وہ ہر اعتبار سے مضبوط اور کرشماتی لیڈر تھیں۔وہ شیعی خواتین کی کل ہند سطح کی پہلی تنظیم "انجمن نسواں برکات عزا" کی مرکزی صدر بنیں۔46نہ صرف حیدرآباد میں مجالس سے خطاب کرتے ہوئے اپنے بعد آنے والی مجلس خواں عورتوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا بلکہ انھوں نے کلکتہ و ممبئی ہندوستان میں اور مشرقی افریقہ میں دارالسلام میں مجالسی دورے کیے اور مجالس سے خطاب کیا۔

(Interview, ZS)

حیدرآباد میں معاصر ذاکرہ عورتوں میں دو اور اہم ذاکرہ اس اہم تشکیلی دور میں نظر میں آتی ہیں: مہدی بیگم، جو اسکول میں استانی بھی تھیں اور مسز وہاب صاحبہ اگرچہ خطابت میں لطیف النساء ان سے بہت آگے تھیں۔

بیسویں صدی میں شیعی مسلمانوں کی قسمت نے بتدریج یاوری میں اضافہ کیا۔اس میں اہم کردار زہرا بیگم کا تھا جو کہ نظام ہفتم کی ماں تھیں اور خود بھی شیعہ تھیں۔انہوں نے اپنے بیٹے کو شیعی مذہب کی طرف گہرے رجحان میں مدد کی، اور نظام ہفتم نے اپنی والدہ کی یاد میں مجالس کے انعقاد کے لیے ایک بڑا عاشورہ خانہ تعمیر کروایا تھا۔نظام ہفتم نے دوسرے عاشورہ خانوں اور محرم کی رسومات کی سرپرستی بھی کی۔

(Moinuddin, 1977: 13)

نظام کی مثال کی پیروی کرتے ہوئے، دوسرے اشراف نے بھی شہر میں محرم کی تقریبات کی سرپرستی بڑے پیمانے پر کی۔آصف جاہی دور کے آخری 50 سالوں میں 10 میں سے 4 دیوان (وزیر اعظم) شیعہ مسلمان بنائے گئے اور نظام کا محکمہ سیاسیہ کے اسٹاف میں اسقدر زیادہ شیعہ مسلمان رکھے گئے کہ عام لوگ اسے محکمہ شیعاسیہ کہنے لگے۔

(Khalidi, 1991: 8)

آصف جاہی دور کے آخر میں مجالس کے بیان بارے دستیاب چند ماخذ میں سے ایک ذاتی یادداشت کی قسم سے ہے جس کا عنوان ہے، "حیدرآباد کی عزاداری جیسا کہ میں نے دیکھا"۔یہ باقر رضوی امانت خانی کی تحریر ہے۔اگرچہ اس میں مشکل سے ہی سن ملتا ہے، اور خطبات کا یا ان کے مشتملات کا ذکر کم ہی ہے، یہ بیان بہت اچھے سے اس زمانے کی حیدرآبادی مجلس کی فضا کو دکھاتا ہے۔سیاق و سباق سے اندازہ ہوتا ہے بیان 1920ء سے تحریر کے لکھنے کے زمانے یعنی 1978ء کے قریب کا ہے لیکن زیادہ ارتکاز آصف جاہی حکمرانی کے آخری سالوں پر ہے۔بیان پہلی محرم سے شروع ہوتا ہے جب سالانہ اور دوارے کی مجلس مختلف شیعی علاقوں میں شروع ہوتی تھیں۔باقر رضوی محرم کے پہلے دس دن (عاشورا) کے دوران منعقد ہونے والی متعدد مجالس کا ذکر کرتا ہے۔اور بعد میں دو

ماہ آٹھ دن کے طویل سوگ کا بھی ذکر کرتا ہے۔ مجلس اس کے مطابق صبح 6 بجے شروع ہوتیں اور سارا دن جاری رہتیں، خاص طور پر نو محرم تک۔ باقر رضوی اپنی توجہ مجالس پر مرکوز رکھتے لے جو کہ اشراف گھرانوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں اور ان میں معروف یا اہم لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔

اس طرح وہ لکھتا ہے کہ جب وزیر اعظم (دیوان)، سالار جنگ سوم، یا نظام خود مجالس میں موجود ہوتے، ایک فوجی دستہ بھی وہاں پر موجود ہوتا، سرخ قالین بچھا کر ان کو خوش آمدید کہا جاتا تھا۔ دوسرے خصوصی مہمانوں کا ذکر سوزخوانی کے دوران پڑھے جانے والے معروف مرثیوں میں کیا جاتا جو شمالی ہندوستان کے معروف مرثیہ گو شاعر دبیر کے پوتے نادر صاحب رفیع کی سوزخوانی کے طرز پر پڑھے جاتے تھے۔ مجالس کے اجتماع میں پیش کیے جانے والے طرح طرح کے پکوانوں اور مشروبات اور ایسی دوسری تفصیلات پر بھی توجہ دی جاتی۔ سالانہ معروف مجالس میں سے ایک کا اہتمام وزیر اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری ہادی علی سید کیا کرتے تھے، جو "کولڈ کافی مجلس" کے نام سے معروف تھی۔ کیونکہ اس مجلس میں بطور تبرک کولڈ کافی پیش کی جاتی تھی۔ تبرک کی دوسری ذکر کردہ اقسام میں فروٹ، چینی مرتبان، رومال میں لپیٹ کر پیش کیا گیا زر، کشمیری چائے اور ایتھوپیائی مٹھائیاں شامل ہیں۔ مزید ذکر کردہ تفصیل میں توپ کے گولے فائر کرنا شامل ہے، مقصد بڑی مجلس کے آغاز کی اطلاع کرنا ہوتا تھا۔ اور بہت سی چیزیں محرم منانے میں استعمال ہوتیں جیسے 14 آئمہ معصومین کے تعزیے، روضے کی شبہیں بنائی جاتی تھیں۔ باقر رضوی ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے جس میں ایک شاعر حلیم آفندی درمیان مجلس خوانی منبر سے گر پڑا اور دم توڑ گیا۔

چند ذاکروں کے نام بھی اس تذکرے کے دوران ملتے ہیں، جیسے مولانا غلام حسنین، جو کہ اپنے بیان کی ثقاہت کے حوالے سے مشہور تھے، ایسے ہی ان کا بیٹا سید آقا۔ اس میں مولانا سید علی نقی شمالی ہندوستان والے اور سید عباس حسنین کا ذکر بھی ہے۔ ان مجلس پڑھنے والوں کے دور میں لاؤڈ اسپیکر سسٹم نہیں ہوتا تھا، لیکن کہا جاتا ہے کہ ان کی آوازیں کسی ایسی چیز کی مدد کے بغیر مجمعے کے آخر تک پہنچ جایا کرتی تھیں۔ باقر رضوی اپنے تذکرے میں جہاں ذاکروں کے نام شامل کرتا ہے، وہیں وہ ایک فہرست ایسے ناموں کی پیش کرتا ہے جن کو وہ خطیب کا نام دیتا ہے۔ اس فہرست میں تحریر لکھنے کے وقت کے ذاکرین کی فہرست ہے نا کہ اس دور کی جس پر اس کا فوکس ہے۔ 47 عورتوں کی مجالس اور ان سے خطاب کرنے والیوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ باقر رضوی لکھتا ہے کہ 50 یا 60 سال قبل (1920ء) میں حیدر۔اد میں خواتین کی مجالس چند ہی ہوا کرتی تھیں، لیکن جب ول 5 یا 6 سال کا تھا تو اپنی والدہ کے ساتھ بعض اوقات ان مجالس میں جایا کرتا تھا۔ وہ معروف ذاکرہ لطیف النساء کا ذکر کرتا ہے جو اپنے مخصوص طرز مجلس خوانی کے لیے معروف تھیں جبکہ دوسری معاصر خواتین ذاکرہ کا ذکر کرتا ہے۔ 48

سیاسی اقتدار کے بغیر مجلس خوانی: آزاد ہندوستان میں حیدر آباد دکن

سن 1947ء میں ہندوستان برطانوی راج سے نجات پا گیا اور ہندوستان و پاکستان میں بٹ گیا۔ نظام حیدر آباد کی ڈومینین کو آزاد رکھنے پر راضی نہ ہونے کے سبب، نئی ہندوستانی حکومت نے 1948ء میں حیدر آباد ریاست پر حملہ کر دیا جسے نرم لفظوں میں "پولیس ایکشن" کے طور پر شہرت ملی۔ جبری طور پر علاقہ ہندوستان یونین کا حصّہ بن گیا۔ اس وقت سے، شیعہ مسلمان برادری نے تیزی سے بدلتے ہوئے دور کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی تبدیلیوں نے کمیونٹی کی مذہبی زندگی اور اس کے محرم منانے پر بھی اپنے نشان چھوڑے۔

نظام کی حکومت ختم ہونے کے ساتھ ہی، پرانی جاگرداری 1949ء میں ختم ہو گئی-ایک جاگیر دار نہ صرف اپنے خاندان کی سپورٹ کرتا تھابلکہ بہت سے خاندان جو اس کے نیچے ہوا کرتے اس درجہ بندی سسٹم میں ان کی کفالت کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا-جیسا کہ ہم ابتدائی تذکروں میں دیکھ چکے ہیں کہ مجالس بھی اشرافیہ کی سرپرستی پر منحصر تھی اور اشراف کی آمدن کا انحصار گاؤں میں ان کی نگرانی میں موجود زمینوں پر ٹیکس پر تھا-جاگرداری کے خاتمے پر زیادہ آمدنی کے چشمے سوکھ گئے اور ساتھ ےاتھ بہت سارے شیعہ خاندان کی کفالت اور نظام حیدرآباد کے دور میں محرم پر شاہانہ خرچ بھی رک گیا جو کہ حیدرآبادی کلچر کا ایک نمایاں پہلو تھا-مسلمان (نظام شاہی) راج کے خاتمے، علاقائی اور قومی خوفناک کشاکش کے ساتھ جو انڈیا کی تقسیم کے نتائج تھے جن میں سے ایک مبینہ دشمن اسلامی ریاست پاکستان کا قیام بھی تھا کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے وہ ایک مشکل وقت تھا-پرانی حیدرآبادی اشرافیہ میں بہت کم لوگ تھے جو رسمی طور پر پڑھے لکھے تھے کیونکہ پرانے جاگیرداری نظام میں ان کو کبھی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی-زندگی گزارنے کی قیمت میں اضافے، اردو کی قیمت پر تیلگو زبان اور کلچر پر زور کے سبب بہت سے حیدرآبادی مسلمانوں نے حیدرآباد سے دور رہنے میں عافیت جانی اور وہ نئے بننے والے ملک پاکستان کی طرف پولیس ایکشن کے دوران روانہ ہو گئے-جبکہ خاص طور پر نوجوان تعلیم یافتہ حیدرآباد سے لندن چلے آئے، اس وقت وہاں امیگریشن کرنا آسان لیکن مستقل طور پر آباد ہونے کا پروسس بہت تکلیف دہ تھا-

(Naqvi,1998: 15)

جیسے حیدرآباد سے باہر ہجرت واقع ہوئی، ایسے ہی پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد کے اندر ہندو، سنّی مسلمان اور شیعہ مسلمان بھی باہر سے آئے-سنّیوں کے ساتھ شیعہ مسلمان بھی پرانے حیدرآباد سے ملحق بڑے بڑے دیہاتوں سے حیدرآباد ضلع میں آئے جہاں مسلمان کل آبادی کا 15 فیصد تھے-پرانے شہر حیدرآباد میں تبادلہ آبادی کے سبب مسلمان کل آبادی کا 40 فیصد ہو گئے-49

دوسرے شیعہ زیادہ دور سے آئے تھے، جیسے شیشہ ساز برادری جو دہلی سے ہجرت کر کے آئی تھی-آبادی اس نمایاں نقل و حرکت کے ساتھ، حیدرآباد میں آزادی تک شیعہ برادری کی آبادی کے ٹھیک ٹھیک اعداد و شمار لانا آسان نہیں ہے-شمار کوئی بھی ہو لیکن 1951 اور 1961 کی مردم شماری کے مطابق شیعہ کی تعداد میں حیدرآباد کے اندر بڑی کمی دیکھنے میں آئی-اس کمی کی وجہ بڑی تعداد میں لوگوں کا پاکستان اور دوسرے ممالک کی طرف ہجرت کر جانا تھا-پرانے حیدرآباد شہر کا ایک سروے یونیورسٹی آف حیدرآباد کی ٹیم نے کیا جس کی سربراہی ڈاکٹر رتنا نائیڈو نے کی تھی-یہ سروے 1990ء میں شایع ہوا اور اس میں پرانے شہر میں شیعہ آبادی 68،704 بتائی گئی (کل آبادی کا 5-21 فیصد) یہ 1951ء کے اعداد و شمار تھے اور 1961ء میں محض 9078 (یعنی کل آبادی کا 5-5 فیصد-یعنی دس سالوں میں شیعہ آبادی کا تناسب 20 فیصد گھٹ گیا یعنی 60 ہزار شیعہ لوگوں کی کمی آگئی-

(Naidu, 1990: 24)

رتنا نائیڈو کے سروے کے مطابق شیعہ آبادی اگلے دس سالوں میں بڑھ کر 12541 ہو گئی (کل آبادی کا 89-5)-لیکن 1971ء کے اعداد و شمار 1971ء کی مردم شماری کے مونو گراف میں دیے گئے اعداد و شمار سے ٹکراتے ہیں، جس میں شیعی آبادی کو 20 سے 40 ہزار کے درمیان بتایا گیا ہے (جبکہ حیدرآباد وقف بورڈ نے جو اعداد و شمار بتائے تھے یہ اس سے کم تھے)

(Moinuddin, 1977: 25, 47)

نائیڈو کا سروے دارالشفا کے علاقے میں 1961ء سے 1981ء تک شیعہ آبادی کو ہندوستان کی مردم شماری کے مونو گراف سے کم کر کے دکھاتا ہے جبکہ یہ علاقہ سنّی اور شیعہ دونوں کے نزدیک شیعہ آبادی کا مرکزی علاقہ تھا-اور یہیں پر شیعہ مسلمانوں کی مرکزی مسجد تھی-یہ امکان ہے کہ خاص طور پر 1961ء کی مردم شماری کے وقت شیعہ کی تعداد اس لیے کم ہو کہ ایک تو ہجرت ہوئی اور دوسرا برادری عدم تحفظ محسوس کرتے ہوئے تقیہ پر عمل کر رہی تھی اور اپنے آپ کو غیر شیعہ بتا رہی تھی-اس طرح سے شیعہ آبادی جتنی حقیقت میں تھی اس سے کم ظاہر ہوئی ہو- 50 مڈل

ایسٹ میں تیل کی دریافت نے 1970ء کے اوائل میں حیدر آباد کے مسلمانوں کی آبادی کے انخلاء کا ایک اور نمونہ دیکھا-ان میں مزدور پیشہ اور نیم ہنر مند ٹیکنیشن نے خلیجی عرب ممالک میں پرکشش روزگار کے مواقع دیکھے جیسے سعودی عرب اور عرب امارات-51 پاکستان اور گلف ممالک کو ہجرت کرنے والوں کے درمیان ایک اہم فرق یہ تھا کہ گلف جانے والوں کے لیے کام کے ختم ہو جانے کے بعد وہیں بس جانا ممکن نہ تھا-اگرچہ ہندوستانیوں کو گلف ممالک نے ورک پرمٹ تو دیے لیکن پاکستان کی طرح ان کو شہریت نہیں دی گئی-گلف میں کام کرنے والے مسلمانوں نے اپنی بچتوں کو حیدر آباد میں جائیداد خریدنے میں صرف کیا نا کہ ان ممالک میں جہاں وہ کام کرتے تھے-ہجرت کی اس لہر نے حیدر آباد کی مسلمان برادری بشمول شیعہ کو کافی فائدہ پہنچایا-اس طرح سے امیر لوگوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہوا جو پرانی زمیندار اشرافیہ سے بڑی حد تک مختلف تھا-

(Naqvi, 1998: 15–16)

گزشتہ 30 سالوں میں حیدر آباد کے پڑھے لکھے شیعہ مسلمان بڑی تعداد میں شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور برطانیہ منتقل ہوئے ہیں-ایسے حیدر آبادی تارکین وطن نے بھی حیدر آباد میں رہ جانے والے رشتہ داروں کو رقوم بھیجی ہیں-

سن 1979ء میں انقلاب ایران کے بعد کے فوری سالوں میں ایران اور شیعی اسلام کے بارے میں جاننے کی دلچسپی پوری دنیا میں پیدا ہوئی-ایرانی انقلاب شیع مذہبی اور سیاسی فکر میں اہم پیش رفت کا سبب بنا-ایران میں نماز جمعہ کے خطبات، خاص طور پر تہران یونیورسٹی میں اور ساتھ ساتھ محرم کی مجالس کے خطبات انقلاب کی حمایت کو بڑھانے اور بعد ازاں مستحکم کرنے کے کام آئے-

(Ram, 1994: 24–32)

بعض طریقوں میں، ایران میں ہونے والی اس پیش رفت نے حیدر آباد میں شیعہ برادری پر بہت تھوڑا اثر ڈالا-

حیدر آبادی شیعہ نے ایرانی انقلاب اور اس کے رہنماؤں کا بڑے پیمانے پر لحاظ رکھتے ہوئے اپنی مقامی روایتوں سے گہرے شغف کا مظاہرہ کیا- مجلس کی تقریریں مثال کے طور پر قابل ذکر حد تک مکمل طور پر سیاسی جہت سے خالی رہیں-

ایرانی انقلاب نے حیدر آبادی شیعہ کی خود اعتمادی پر اہم اثر ڈالا-میں نے حیدر آباد کی شیعہ برادری کے بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ ایران میں ہونے والے واقعات نے ان کی بطور شیعہ مسلمان خود اعتمادی اضافہ کیا اور ان کو زیادہ سنجیدگی سے اپنے مذہب کو لینے کے لیے حوصلہ بخشا-شیعہ برادری میں نئی امارت آنے اور ایرانی انقلاب سے حوصلہ واعتماد پیدا ہونے نے گزشتہ 30 سالوں میں محرم کی مجالس کی کارکردگی میں ڈرامائی بہتری پیدا کی ہے-ایک سروے ہندوستان کے محکمہ مردم شماری نے 1971ء میں کیا اور محرم کی تقریبات کی تفصیل اکٹھی کی-سروے نے کوشش کی کہ وہ عاشورا کے دوران شیعہ، سنّی اور ہندوؤں کی جانب سے بڑی مجالس کے انعقاد کی تفصیلات اکٹھی کے-

(Moinuddin, 1977: 59–67)

اس سروے کے مطابق محرم کے دوران شیعہ کے درمیان 105 مجالس عزا منعقد ہوتی تھیں جن میں سے 79 پہلے دس روز ہوتی تھیں۔اس میں بعدازاں پانچ عشرہ سیریز بھی شامل ہوگئیں(مجالس جو یکم محرم سے 9 محرم تک روزانہ منعقد ہوا کرتی تھیں) مجالس کے دو سلسلے صفر کے مہینے میں 4 روز اور 14 روز تک بترتیب سے منعقد ہوا کرتے تھے۔ 52 زیادہ تر مجالس کو ابھی تک سپانسر پرانے اشراف طبقات کرتے تھے لیکن اس میں رضاکار گروہ جیسے ماتمی گروہوں نے بھی مجالس کو سپانسر کرنا اور ماتمی جلوسوں کی قیادت کرنا شروع کردی تھی۔سال میں کتنی مجالس ہوا کرتی تھیں،ان کا شمار کرنا بس سے باہر ہے۔ڈیوڈ پنالٹ (6:1992) میر علی زوار کی بات نقل کرتے ہیں جو حیدرآبادی ماتمی سنگتوں کے بانیان میں سے ایک تھے جو کہتے ہیں:

"آج ہر شخص اپنے گھر میں مجلس عزا بپا کرنا چاہتا ہے؛ یہاں آج پہلے سے کہیں زیادہ مجالس اور بہت سے پروگرام ہوتے ہیں۔مجالس پہلے تو چند خاص منتخب لوگوں کا خاصا تھیں؛اب ایسا لگتا ہے کہ یہ بہت سارے لوگوں کی دسترس میں ہیں۔'

جیسے مجالس کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ویسے ہی ذاکرین وذاکرہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

سن 70 اور 80 کے عشروں میں ہر سال آگرہ شمالی ہندوستان میں ایک اہم قومی اجتماع کا انعقاد ہونا شروع ہوا جس میں نوجوان شیعہ کی مجلس خواں کے طور پر اپنا کریئر شروع کرنے کی ترغیب دی جانے لگی۔اس اجتماع میں آداب مجلس خوانی معروف عالم سید مظفر حسین طاہر جرولی سکھایا کرتے تھے۔یہ سہ روزہ اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں ہزاروں شیعہ عزاداران شرکت کرتے تھے۔پندرہ پندرہ منٹ کے وقفے سے مجلس ہوتی جبکہ کھانے کا وقفہ ذرا طویل ہوا کرتا تھا۔

مجالس نماز فجر کے بعد شروع ہوا کرتیں اور آدھی رات تک جاری رہا کرتیں۔سارے ہندوستان سے مجلس خوان بلائے جاتے،ایک دوسرے کے خطبات کو سنا جاتا،ایک دوسرے پر تبصرے ہوتے اور اکٹھے کھانے کی میز پر وہ ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔یہ کنونشن بہت اہم مرکز/فورم تھا جس میں مجلس خواں جو مختلف علاقوں سے آتے اور مختلف سیاق وسباق کے ساتھ ہوتے ایک دوسرے سے سیکھتے اور مجالس خوانی میں نئی پیش رفت کو باہم شئیر کرتے تھے۔اور اس پلیٹ فارم سے نئے ذاکر اپنا نام منوالیا کرتے تھے۔

(interview, SN)

گزشتہ 30 سالوں میں دولت اور اعتماد میں اضافے کے باوجود حیدرآبادی شیعہ کے لیے زمانہ آسان نہیں رہا ہے۔ایک مسئلہ جو حیدرآباد کے تمام باسیوں کو عموماً اور پرانے شہر کے باسیوں کے لیے خاص طور پر درپیش رہا ہے وہ ہے ہندؤ اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ تشدد کا بار بار پھوٹ پڑنا۔شہر سے لوگوں کی ہجرت اور شہر میں داخل ہونے کے عمل نے آزادی کے بعد ہندؤ اور مسلمانوں کے درمیان پر تشدد تصادم کروانے میں حصّہ ڈالا ہے۔ پولیس ایکشن کے زمانے میں 1948 کے تشدد کے بعد،1978ء تک قدرے امن رہا، جس کے بعد حیدرآباد میں سن 1984ء تک ہر سال ہی کم از کم ایک بار فرقہ وارانہ دنگے فساد ضرور ہوئے۔خاص طور پر کسی بھی بڑے مذہبی تیوہار کے موقعہ پر۔ 1978ء سے 1984ء تک ان فسادات میں 400 افراد حیدرآباد میں مارے گئے۔پھر 1990ء تک قدرے عارضی طور پر امن کا زمانہ آیا اور یہ امن وسکون کا دور ایودھیا میں دسمبر 1992ء میں ہندؤ قوم پرستوں کے ہاتھوں بابری مسجد گرائے جانے پر برباد ہوگیا۔پرتشدد فرقہ وارانہ دنگے فساد دس ہفتوں تک جاری رہے اور اس دوران حیدرآباد دکن میں 300 افراد کی جانیں چلی گئیں۔

(Alam, 1992: 87–101 Kakar, 1995: 59–65)

ایک اور مسئلہ جو مسلمان برادری کو عام طور پر فکر مند کرتا رہا ہے وہ حیدر آباد میں اردو بولنے کے چلن میں آنے والی کمی کا ہے- یہ گراوٹ حیدر آباد ریاست کے ہندوستانی یونین میں شامل ہونے کے بعد اس وقت شروع ہوا جب عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم نہ رہی اور آندھرا تلگو ثقافت و زبان کا احیا ہوا- اگرچہ حیدر آباد کی مسلمان آبادی کی اکثریت کی مادری بولی اردو ہے لیکن بہت سارے نوجوان اب اردو لکھ پڑھ نہیں سکتے- اردو بطور بول چال کی زبان کے بالکل ہندی کی طرح ہے جو شمالی ہندوستان کی مرکزی بولی جانے والی زبان ہے- حیدر آباد میں بہت سارے اسکول کے بچوں کے لیے ہندی لازمی زبان ہے اور اس طرح بہت سارے نوجوان حیدر آبادی اردو بول تو لیتے ہیں لیکن وہ لکھتے دیوناگری اسکرپٹ میں ہیں- خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں، انگریزی زیادہ اہم زبان بن گئی ہے جس میں ایک شخص اپنی سیکولر تعلیم حاصل کرتا ہے- انگریزی ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ بزنس کرتا ہے، خاص طور پر سرمایہ دارانہ انفارمیشن ٹیکنالوجی انڈسٹری جس کا حیدر آباد ایک اہم مرکز ہے میں بھی انگریزی کا چلن ہے (حیدر آباد کو اس لیے سائبر آباد بھی کہا جاتا ہے) اردو کے زوال اور انگریزی کے عروج کے اثر کو پہلے ہی مجالس خوانی میں محسوس کیا جا رہا تھا- اردو سے انگریزی کی طرف تبدیلی کو لازمی طور پر شمالی امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا جیسے مقامات پر شیعہ مسلمان تارکین وطن برادری نے بھی محسوس کیا- اگرچہ اب بھی مجالس میں اکثریتی خطبات اردو میں ہوتے ہیں لیکن ذاکر اکثر انگریزی کے الفاظ کو اردو کے ساتھ ملا جلا دیتے ہیں- ماضی قریب میں انگریزی میں مجلس پڑھنا محال سمجھا جاتا تھا- لیکن اب یہاں تک کہ حیدر آباد کی مرکزی شیعہ مسجد "عبادت خانہ حسینی" دارالشفا میں کم از کم ایک مجلس عزا کا خطبہ مکمل طور پر انگریزی میں ہوتا ہے- اور کوئی شک نہیں آنے والے سالوں میں زیادہ مرتبہ اسے دوھرایا جائے گا-

خلاصہ

اس باب میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی جدید شکل میں موجود مجلس عزا کا خطبہ ایک تازہ پیش رفت ہے اور یہ ایک صدی سے زیادہ پرانی نہیں ہے- اگرچہ یہ انتہائی پہلے سے موجود پس منظر سے ہی ابھری ہے- اگرچہ مجلس عزا کا خطبہ نماز جمعہ کے اجتماعات میں دیے گئے خطبوں سے الگ طور پر نمو پایا، لیکن دونوں اشکال کی جڑیں ما قبل اسلامی قبائلی ترجمان جسے خطیب کہتے ہیں میں پائی جاتی ہیں- عزاداری کے اجتماعات جس کو مجلس التعزیہ سے جانا جاتا ہے اور اس میں دیے جانے والے خطبات معرکہ کربلا کے فوری بعد ہی شروع ہو گئے تھے- عزاداری کے طور پر مجالس کے انعقاد کا ایک مقصد کربلا میں جو ہوا اس کی خبر کو پھیلانا اور اور ان کو معرکہ کربلا کی یاد تازہ کرنے کے ذریعے طور پر استعمال کرنا تھا- جیسے ابتدائی خطیب شاعر کے ساتھ کام کرتا تھا، ایسے ہی مجالس میں خطبات بھی شعری روایت کے ساتھ ساتھ پھلے پھولے- آنے والی صدیوں میں مجلس عزا شیعہ مسلمانوں میں ایک مرکزی ادارہ بن گئی جو کہ بڑی مسلم برادری میں بطور ایک مسلمان اقلیت کے ان کی شناخت کو زندہ رکھنے میں اہم ترین کردار کی حامل تھی- تو مسلم سلطنت میں وسعت پیدا ہونے سے شیعہ مسلمان جہاں بھی گئے تو مجلس عزا کو بھی اپنے ساتھ لیکر گئے- شیعہ مسلمان اگر زیر عتاب کہیں رہے تو بھی وہ خفیہ طور پر مجلس عزا کا انعقاد کرتے رہے- جبکہ جہاں پر شیعہ مسلمان حاکم آئے وہاں پر سرکاری سرپرستی کی وجہ سے مجلس عزا زیادہ ترقی پاتی رہی- مجلس عزا کے ارتقاء میں سرکاری سرپرستی کے کردار کو جانچنے کے لیے جن ادوار کا جائزہ اہم ہے ان میں ایران میں صفوی سلطنت (1732/1145-1501/905)، جنوبی ہندوستانی دکن میں قائم ہونے قطب شاہی سلطنت (1687/1098-1501/907) اور شمالی ہندوستانی صوبے میں شیعی گورنر اور پھر سلطنت اودھ (1856/1272-1722/1134) کے ادوار شامل ہیں-

ان سلطنتوں کے تناظر میں رثائی شاعری اور بیانیہ کی خاص اشکال نے ترقی پائی- ہندوستانی مجلس کی روایت میں دو سب سے زیادہ اہم اشکال روضۃ الشہداء کے متن کا خطبہ اور مرثیہ تھیں- بعض اوقات اس کے علاوہ مجلس عزا میں کربلا کے شہیدوں کے مصائب کے کچھ پہلوؤں کو بھی فی البدیہہ خطبے میں شامل کر لیا جاتا تھا- انیسویں صدی کے آخر میں اودھ میں جدید مجلس عزا کا خطبہ تین اشکال سے برآمد ہوا جن کے بارے میں پہلے بتایا جا چکا- متن کو پڑھنے کا بیانیہ اور فی البدیہہ کلام آپس میں مدغم ہوئے اور انہوں نے مرثیے کے بعض اوصاف بھی ساتھ شامل کر لیے جو کہ نثری شکل پر اثر انداز ہو رہا تھا- مرثیہ آزادانہ طور پر مجلس کا اہم پہلو بنا رہا- نئے خطبہ مجلس عزا میں شہدائے کربلا اور آئمہ کے مصائب کے بیان کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات شامل کرنے کا ڈسکورس/

کلامیہ بھی اختیار کیا گیا- تیزی سے بدلاؤ اور سماجی اتھل پتھل کے زمانے میں مجلس عزا کا خطبہ شیعی شناخت پر زور دینے کے لیے بھی استعمال ہوا-ابتداء میں علماء کی صف سے ہی ذاکر مرد مجالس پڑھا کرتے تھے، لیکن 20ویں صدی کے وسط میں عام لوگ بھی جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے مجلس خوانی میں شامل ہو گئے-

اگرچہ حیدر آباد میں ابتدائی مجلس نے شمالی ہندوستان میں ہونے والی نئی پیش رفت کی پیروی کی لیکن اس کی اپنی نمایاں خصوصیات اور اپنے معروف ذاکر بھی تھے-حیدر آبادی مجلس اور محرم کی دوسری تقریبات کی آصف جاہی نظام حاکموں کے دور میں اشراف نے شاہانہ انداز میں سرپرستی کی، خاص طور پر بیسویں صدی کے پہلے نصف دور میں- 1948ء میں حیدر آباد ریاست کو جبری طور پر نئی آزاد ہندوستان ریاست میں شامل کر لیا گیا- جس کے سبب مسلمان راج کا خاتمہ ہوا اور نتیجے میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر ہجرت دیکھنے کو ملی، خاص طور پر امیر مسلمان خاندان ہجرت کر گئے-شیعہ برادری 1970ء سے زیادہ پر اعتماد نظر آئی اور اس کا سبب گلف ممالک میں روزگار کے مواقع ملنے سے بڑھنے والی دولت اور ایران میں شیعہ اسلامی انقلاب تھا- اس کا ایک نتیجہ ہر سال شہر میں مجالس عزا اور وہاں پر مجلس پڑھنے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ تھا-

تاریخ کے مختلف ادوار اور ثقافتوں میں، مجلس اور اس کا پیغام ان تناظر کے پہلوؤں پر مشتمل رہا جن میں وہ منعقد ہوا کرتی تھیں-لیکن ایسے اکٹھ کی جوہری فطرت و نوعیت ہمیشہ سے ایک رہی: واقعہ کربلا کو بیان کرنا اور عزاداری کرنا تا کہ شیعی شناخت کو تقویت ملتی رہے-